فصلنامہ راہ اسلام

شمارہ : ۱۹۳ - جولائی تا ستمبر ۲۰۰۴ء

خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران ۔۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی -۱۱۰۰۰۱
فون: ۲۳۳۸۳۲۳۲، ۳۳، ۳۴
فیکس: ۲۳۳۸۷۵۴۷
http://www.iranhouseindia.com
e-mail:director@iranhouseindia.com

* ایڈیٹر،پرنٹروپبلشر:

جلال تملہ

*معاونین علمی:

ڈاکٹر علی محمد نقوی

ڈاکٹر اختر مہدی رضوی

*معاونین فنّی:

*تزئین کار : مجید احمدی وخانم عائشہ فوزیہ

*کمپوزنگ : قاری محمد یاسین

*پریس : اے ۔ ایس ٹائپ سیٹر 4903 گراؤنڈ فلور
چاندنی چوک دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۶

* ناشر : خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران
۱۸ ۔ تلک مارگ ۔ نئی دہلی ۔ ۱۱۰۰۰۱

توجہ

قارئین کرام ! سلام علیکم

فصلنامہ راہ اسلام آپ کا اپنا رسالہ ہے اور اس کی فضیلت وافادیت میں کسی قسم کا اضافہ آپ کی خصوصی توجہ وتعاون کے بغیر قطعی ناممکن ہے۔

ادارہ اس رسالہ کی تعداد اشاعت میں اضافہ اور کیفیت میں قدرے بہتری کا خواہاں ہے۔ لہذا تمام قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا مبلغ اشتراک یعنی سو روپیہ سالانہ درج ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔ اس اشتہار کے بعد رسالہ کی اگلی کاپی انھیں لوگوں کو ارسال کی جائے گی جن کا مبلغ اشتراک ادارہ کو حاصل ہو چکا ہے۔

☆☆☆☆

ایران کلچر ہاؤس۔ ۱۸، تلک مارگ، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۰۱

راہ اسلام میں شائع ہونے والے ہر مقالے کا اسلامی جمہوریہ ایران کے نظریات کے مطابق ہونا لازمی نہیں ہے۔

آیت الکرسی

فہرست

اداریہ	اسلام اور انسان	ادارہ	۶
عقائد شناسی			
	شیعوں کی مذہبی فکر اور	علامہ محمد حسین طباطبائی	۱۰
	وحدانیت خدا		۳۶
	اسلام میں توحید کا تصور	آیت اللہ شہید بہشتی و شہید باہنر	۳۵
قرآن شناسی	تفسیر سورہ الحمد	مولانا سید علی محمد نقوی	۴۷
	سائنسی نظریات اور قرآن	ڈاکٹر سلطان حسن ترابی	۶۸
حدیث شناسی	طلب علم	علامہ محمد رضا حکیمی	۸۱
سیرہ و تاریخ	زندگانی پیغمبر اسلامؐ	آیت اللہ جعفر سبحانی	۸۹
	آصف سابع اور مولانا ناصر حسین	پروفیسر سید امیر حسن عابدی	۱۰۳
ادیان و مسالک	اسلام اور دیگر ادیان و مذاہب	ایس۔ ایم۔ حسین	۱۱۹
	اسلامی فرقے	پروفیسر سید جعفر رضا	۱۲۵
فرہنگ و تمدن	بنگال کے صوفیائے کرام	ڈاکٹر شاہد اقبال	۱۳۹
تعلیم و تربیت	خانقاہی مدارس میں نصاب و نظام تعلیم	پروفیسر سید محمد عزیز الدین	۱۵۳
شعر و ادب	ہندوستان کی فارسی شاعری	ڈاکٹر جابر علی انصاری	۱۶۵
	امام عصر سے	مجتبیٰ سنبھلی	۱۷۳
	منقبت	یحییٰ سنبھلی	۱۷۳

اداریہ:

اسلام اور انسان

اسلامی تقویم میں ماہ رجب المرجب کو غیر معمولی عظمت وفضیلت حاصل ہے۔ یہ مولائے متقیان حضرت علی بن ابیطالب (ع) کی ولادت، پیغمبرؐ کی حفاظت کی راہ میں نا قابل فراموش قربانیاں پیش کرنے والے ابو طالب کی رحلت اور پیغمبرؐ عظیم الشان کی بعثت کا مہینہ ہے اور اس مہینے کی عظمت وفضیلت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے اس مہینے کو اپنی ذات سے وابستہ کر رکھا ہے اور یہ رسول اللہ کا مہینہ ہے لہذا یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس منجی بشریت اور اس کے وصی وجانشین کا تذکرہ کیا جائے جو یقیناً ایک بہترین تذکرہ اور خالق کائنات کی زبان میں عظیم اسوۂ حسنہ ہے۔

درحقیقت پیغمبر اکرمؐ دو اہم خصوصیات کے حامل تھے۔ ان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کی صورت میں خداوند عالم کے الٰہی پیغام کو دنیا والوں تک پہونچایا۔ انہوں نے اعلان فرمایا کہ ”میں خدا کا پیغمبر ہوں اور تم لوگوں کے درمیان اس کا پیغام لیکر آیا ہوں“۔ لوگوں نے ان کی بات پر یقین کرلیا۔ لیکن غور طلب بات تو یہ ہے کہ لوگوں نے کیسے یقین کرلیا؟ وہ کونسی چیز ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں یہ اعتقاد واعتماد پیدا ہوگیا کہ پیغمبر جو خبر دے رہے ہیں وہ درست ہے۔ واضح رہے کہ اس عوامی اعتماد کے پیچھے خود پیغمبر عظیم الشان کی ذات اور ان کے وجود مبارک کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ پیغمبرؐ نے فرمایا اے لوگوں! اگر میں تم لوگوں سے یہ کہوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے کچھ لوگ موجود ہیں تو تم یقین کرلوگے؟ لوگوں نے جواب دیتے ہوئے کہا: ہاں اے محمد ! بالکل یقین کرلیں گے کیونکہ تم

صادق وامین ہو پیغمبرؐ نے کہا میں خدا کا رسول ہوں اور اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔ حضرت خدیجہ(س) اور حضرت علیؑ نے آگے بڑھ کر ان کے اس قول کی تائید کردی۔ پتہ چلا کہ پیغمبرؐ کا وجود قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی ضمانت ہے۔لوگوں پر پیغمبر کی صداقت وامانت کا ایسا گہرا اور اٹوٹ اثر تھا کہ انہوں نے کہا اور لوگوں نے ان کی بات فوراً تسلیم کرلی۔

پیغمبر اکرمؐ کی دوسری اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ شرح صدر کے حامل تھے یعنی پوشیدہ اور آشکار دونوں باتوں سے بخوبی آگاہ تھے اور پوشیدہ وظاہر دونوں سے آگاہ رہتے ہوئے لوگوں کے ساتھ پیغمبر کے برتاؤ کا تعین یقیناً ایک دشوار امر ہے۔ اگر کوئی مالدار محتاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مالی امداد طلب کرے تو ایسی صورت میں پیغمبرؐ کا برتاؤ کیا ہونا چاہئے۔قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے اے رسول ! آپ کے اخلاق حسنہ کی وجہ سے لوگ آپ کے اردگرد جمع ہوجائیں گے چنانچہ پیغمبر کا حسن اخلاق دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ بن گیا۔

جی ہاں ! سیرت پیغمبرؐ ہر مسلمان کے لئے اسوہ حسنہ ہے اور ہم لوگوں کو ان کی سیرت کو نمونۂ عمل قرار دینا ہے۔ اس پیروی کی ایک شکل تو یہ ہے کہ پیغمبرؐ چودہ سو برس قبل اس دنیا میں تشریف لائے اور ۶۳ سال تک اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بعد یہاں سے رخصت ہوگئے۔وہ ہم لوگوں کے درمیان دو عظیم وگرانقدر چیزیں چھوڑ گئے قرآن مجید اور اپنی سیرت کا عملی نمونہ یعنی اپنے اہلبیت اطہار علیہم السلام ۔ اب یہ فیصلہ ہم لوگوں کو کرنا ہے کہ ہم ان دونوں کی ایسی پیروی کریں کہ خداوند عالم کی رضا وخوشنودی حاصل ہوجائے اور اس خوشنودی الٰہی کے نتیجے میں خداوند عالم ہمیں بہشت کی دولت سے مالامال کردے اور خداوند عالم نے ایک صاحب عقیدہ مسلمان کے لئے جن نعمتوں کا وعدہ فرمایا ہے وہ ہمیں حاصل ہوجائے اور اس میں پیغمبر کا موجود ہونا لازمی نہیں ہے بلکہ معاملہ ہمارے اور ہمارے پروردگار کے درمیان ہے ہم خداوند عالم کی عبادت کرتے ہیں تاکہ وہ ہمیں بہشت عطا کردے۔ دوسری عبارت میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے عمل ومعاملہ کا مرکز قرآن کریم کے احکام ہیں۔

مسلمان ہونے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ عالمانہ انداز میں مکمل دلیل ومنطق کے ساتھ ہم لوگ اسلامی احکام کی مکمل معرفت کے ساتھ اس کی پیروی کریں۔غوروفکر سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ ہم جھوٹ کیوں نہ بولیں؟ حلال رزق کیوں کھائیں؟ اور حرام چیزوں سے پرہیز کیوں اختیار کریں؟ دوسرے لفظوں میں عالمانہ واقفیت کے ساتھ عالمانہ عمل وپیروی کرنے کی ضرورت ہے تا کہ ہم عالمانہ اور آگاہانہ مسلمان کی حیثیت سے زندگی بسر کرسکیں اور اس طریقۂ کار میں بھی پیغمبر کی موجودگی لازمی نہیں ہے لیکن ان طریقوں کے علاوہ مسلمان ہونے کا ایک تیسرا طریقہ بھی ہے جس کے لئے پیغمبر اکرمؐ کی طرف توجہ لازمی ہے اور یہ طریقہ عشق وعرفان کا طریقہ ہے جس میں مرشد کی حیثیت سے انسان خداوندعالم کی عظیم الشان مخلوق یعنی ذات رسول اکرمؐ کا نیازمند ہے اور ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر ان سے اپنی بیعت کا اعلان کرتا ہے۔درحقیقت یہ انتہائی دشوار اور غیرمعمولی مشکل کام ہے۔تصور کیجیے کہ آپ بارگاہ رسالتؐ میں کھڑے ہوئے ہیں۔آپ ان سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔اگر آپ ان سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اور ان کے ساتھ محبت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو ان سے ہماری رفاقت ودوستی کا تقاضہ یہ ہے کہ ہمارے اور پیغمبر کے درمیان کوئی چیز قدر مشترک ہو۔ آپ پیغمبر کے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دینا اور ان کی بیعت کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ہمراہ معراج پر جاکر خدا کی قربت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔کیا آپ نے کبھی یہ غور کیا ہے کہ اس راہ میں آپ کتنی دور تک ان کا ساتھ دے سکیں گے؟! دوسری طرف ہم لوگوں کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومین علیہم السلام اذن الٰہی سے لوگوں کے دلوں میں چھپی ہوئی باتوں کو جان لیتے ہیں۔میرا سوال یہ ہے کہ ہم لوگوں کے درمیان ایسے کتنے لوگ موجود ہیں جو امام مہدی آخرالزماں (عج)، مولای متقیان حضرت علی علیہ السلام اور پیغمبر اکرمؐ کی نگاہوں کی تاب لاسکیں گے۔

واضح رہے کہ کسی مذہب یا مکتب فکر کی شناخت کے دو طریقے ہوتے ہیں۔پہلا

طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مطلوبہ مذہب ومکتب فکر کی کتاب یا اس کے بارے میں موجود ادب کا بھرپور مطالعہ کیا جائے اور دوسرا طریقہ ان افراد کی طرف رجوع کرنا جن کے اعمال نے یہ ثابت کردیا کہ اس مذہب کی تعلیمات پر عمل کیا جاسکتا ہے اور مذہب اسلام میں ایسی نمونہ عمل شخصیت کا نام علی بن ابی طالب علیہ السلام ہے۔ مذہب اسلام میں انسان ایک خدا طلب مخلوق کا نام ہے اور اس مذہب سے وابستہ ہر انسان خدا طلب اور منزل کمال کی طرف گامزن ہے۔ اس مذہب میں انسان انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی ذمہ داریوں کا حامل ہے۔ مذہب اسلام میں ایسے انسان کی صفات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مصر کے گورنر مالک اشتر کے نام امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے اس تاریخ ساز فرمان کا مطالعہ کیا جائے جس میں انھوں نے معاشرہ میں موجود ہر طبقے کے لوگوں کے حقوق کی اہمیت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اسلامی معاشرہ میں غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے۔ اے مالک ! ''تمہاری مملکت میں دو طرح کے لوگ ہیں ان میں سے ایک تمہارے ایمانی بھائی ہیں اور دوسرے تمہارے انسانی بھائی ہیں۔ جن سے خطا وغلطی کا امکان بھی ہے۔ پس تم انھیں اسی طرح معاف کردینا جس طرح تم چاہتے ہو کہ تمہارا رب تمہاری خطاؤں کو معاف کردے۔''

امیر المومنین حضرت علیؑ نے اس فرمان میں عدالت کو دوسری اہم صفت قرار دیتے ہوئے سماجی، اقتصادی سیاسی، انفرادی اور طبقاتی عدالت اور اس کی افادیت پر سیر حاصل بحث کی ہے اور یہ بیان فرمایا ہے کہ عدالت کا بنیادی نتیجہ نورانی معاشرہ کی تخلیق ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں زندگی بسر کرنے والوں کو ظلم ودہشت گردی کا کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ ہر انسان کے حقوق کا خیال رکھتے ہوئے سیدھے راستہ پر منزل مقصود کی طرف گامزن دکھائی دیتا ہے۔ اور یہی راہ مستقیم درحقیقت ''راہ اسلام'' ہے۔

☆☆☆☆

عقائد شناسی

علامہ محمد حسین طباطبائی

شیعوں کی مذہبی فکر

شیعیت میں فلسفیانہ اور دینی خیالات

جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، اسلام نے عقلی فکر کو جائز قرار دیا ہے اور اس کی تائید کی ہے اور اسے دینی فکر کا ایک حصہ تصور کرتا ہے۔ عقلی فکر اپنے اسلامی معنوں میں رسول اکرمؐ کی پیشین گوئی کی تصدیق کرتے ہوئے کلام اللہ یعنی قرآن مجید کے ظاہری پہلو اور آنحضرتؐ اور آپ کے اہل بیتؑ کی مسلمہ حدیثوں کی صحت کا عقلی استدلال پیش کرتی ہے۔

عقلی ثبوت انسان کو اس کی خداداد فطرت کی بدولت مختلف مسائل حل کرنے میں مدد دیتے ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں یعنی برہان اور جدل۔ برہان وہ ثبوت ہے جس کے مقدمات درست ہوں (حقیقت سے مطابقت رکھتے ہوں) خواہ وہ قابل مشاہدہ اور واضح نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک قول یا مسئلہ ہوتا ہے جس کا انسان اپنی خداداد ذہانت سے ادراک کرتا ہے اور اس کی لازمی طور پر تصدیق کرتا ہے۔ مثلاً جب وہ اس بات کو سمجھتا ہے کہ تین کا ہندسہ چار سے چھوٹا ہوتا ہے، اس قسم کی فکر کو عقلی فکر کہا جاتا ہے اور جب اس کا تعلق دنیا اور انسان کے آغاز و انجام جیسے عالمگیر مسائل اور کلیات سے ہو تو اس قسم کی فکر فلسفیانہ فکر کہلاتی ہے۔

'جدل' ایک ایسا ثبوت ہے جس کے تمام یا کچھ مقدمات قابل مشاہدہ اور یقینی معلومات پر مبنی ہوتے ہیں مثلاً کسی مذہب کے ماننے والوں کا عام طریقہ یہ ہو کہ وہ اپنے اپنے دینی عقائد کو اس مذہب کے یقینی اور واضح اصولوں کے حوالے سے ثابت کریں۔

قرآن مجید نے یہ دونوں طریقے استعمال کیے ہیں اور بہت سی آیات میں ان کی توثیق کی گئی ہے۔ سب سے پہلے وہ عالم ہستی کے آفاقی اصولوں اور کائنات کے عام نظام اور ساتھ ہی آسمان، دن، رات، زمین، آسمان، چاند ستاروں، سیاروں، جانوروں اور انسانوں وغیرہ جیسے مخصوص نظاموں کے بارے میں آزادانہ تحقیق اور غور وفکر کا حکم دیتا ہے۔ وہ ان اشیاء کے بارے میں ذہنی کاوشوں کی بیحد تعریف کرتا ہے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید نے انسان کو جدلی غور فکر کا حکم دیا ہے (جسے عموماً کلامی بحث کہا جاتا ہے) بشرطیکہ اسے بہترین طریقے سے انجام دیا جائے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مقصد کسی جھگڑے کے بغیر حقیقت کا اظہار ہو اور اس میں وہ اشخاص حصہ لیں جو ضروری اخلاقی فضائل کے مالک ہوں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

''اے رسولؐ! تم لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحتوں کے ذریعے اپنے پروردگار کی راہ پر بلاؤ اور بحث ومباحثہ (وجادِلھم) بھی کرو تو اس طریقے سے جو سب سے اچھا ہو۔'' (سورہ نحل۔ آیت ۱۲۵)

اسلامی فلسفہ اور کلام میں اہل تشیع کی پیش قدمی

جہاں تک علم کلام کا تعلق ہے یہ امر واضح ہے کہ ابتدائی دور میں ہی اکثریت سے الگ ہونے کے بعد ہی شیعوں نے اپنے مخصوص نقطہ نگاہ کے بارے میں اپنے مخالفین سے بحث ومباحثہ شروع کر دیا تھا۔ یہ درست ہے کہ مناظرہ کے دو فریق ہوتے ہیں جو اس میں حصہ لیتے ہیں تاہم شیعہ مسلسل پیش قدمی کرتے تھے علم کلام کی بتدریج ترقی کے ساتھ ساتھ جو دوسری اور تیسری صدی ہجری میں معتزلہ مکتب کی اشاعت کے ساتھ عروج کو پہنچ گئی شیعہ علماء، جو مکتب اہلبیتؑ کے تربیت یافتہ تھے، علم کلام کے صف اول کے استاد بن گئے[1] علاوہ ازایں سنی علمائے دینیات کا سلسلہ بھی۔ خواہ وہ اشعری ہوں، معتزلہ ہوں یا کوئی اور ہوں۔ شیعوں کے پہلے امام یعنی

حضرت علیؑ سے جاملتا ہے۔

جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے یہ جو لوگ اصحاب رسولؐ (جن کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی اور جن میں سے بارہ ہزار کے نام ضبط تحریر میں لائے گئے ہیں) کے اقوال سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ان میں فلسفیانہ مسائل کے بارے میں زیادہ مواد موجود نہیں ہے۔ یہ فقط حضرت علیؑ ہی ہیں جن کے مابعد الطبیعیات کے بارے میں گرانبہا ارشادات میں عمیق ترین فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں۔

صحابہ کو اور ان کے بعد آنے والے علماء کو بلکہ زمانے کے عربوں کو بالعموم آزادانہ عقلی مباحث سے کوئی واقفیت حاصل نہ تھی۔ پہلی دو صدیوں سے تعلق رکھنے والے علماء کی تحریروں میں فلسفیانہ خیالات کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ فقط ائمہ اہلبیتؑ کے عمیق اقوال میں اور بالخصوص پہلے اور آٹھویں امام کے ارشادات میں اسلامی فلسفیانہ خیالات کا لامحدود خزانہ ملتا ہے۔ وہی بزرگوار تھے جنہوں نے اپنے کچھ شاگردوں کو اس انداز فکر کی تعلیم دی۔

دوسری صدی ہجری تک، جب بعض فلسفیانہ تصانیف کو عربی میں ترجمہ کیا گیا، عرب فلسفیانہ خیالات سے ناواقف تھے۔ بعد میں تیسری صدی ہجری میں بہت سی فلسفیانہ تحریریں یونانی اور سریانی سے عربی میں منتقل کی گئیں اور ان کی بدولت عام لوگ فلسفیانہ طرز فکر سے آشنا ہوئے تاہم دینیات اور فقہ کے اکثر علماء فلسفے اور دوسرے عقلی علوم کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ چونکہ ان علوم کو حکومت وقت کی سرپرستی حاصل تھی اس لئے ابتداء میں ان کی مخالفت زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوئی تاہم حالات میں بہت جلد تبدیلی رونما ہوئی اور بڑے سخت احکامات کے تحت بہت سی فلسفیانہ کتابیں ضائع کردی گئیں رسائل اخوان الصفاء جو بعض نامعلوم مصنفین کی تصنیف ہے اس زمانے کی یاد دلاتی ہے اور اس دور کے نامساعد حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔

اس مشکل دور کے بعد چوتھی صدی ہجری کی ابتداء میں مشہور فلسفی ابونصر فارابی کے

ہاتھوں فلسفے کا احیاء ہوا اور پانچویں صدی ہجری میں مشہور عالم فلسفی ابن سینا کی تصانیف کی بدولت ارسطو کے فلسفے نے ترقی کی تمام منزلیں طے کرلیں، چھٹی صدی ہجری میں شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی نے فلسفہ اشراق ترتیب دیا جس کی بنا پر اسے صلاح الدین ایوبی کے حکم کے تحت قتل کردیا گیا۔ اس کے بعد سنی دنیا یعنی مسلمانوں کی اکثریت میں فلسفے کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد مسلمانوں کے اس طبقے میں اندلس کے علاوہ کہیں کوئی قابل ذکر فلسفی پیدا نہیں ہوا۔ اندلس میں چھٹی صدی ہجری میں ابن رشد نے فلسفے کا احیاء کیا۔ [۳]

فلسفہ اور عقلی علوم میں اہل تشیع کا حصہ

جس طرح ابتدائی دور میں شیعیت نے اسلامی فلسفیانہ فکر کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا، بالکل اسی طرح شیعہ علماء دیگر اسلامی علوم کی پیشرفت میں بھی بہت مدد اور معاون ثابت ہوئے۔ اگر چہ ابن رشد کی وفات کے بعد فلسفہ سنی دنیا سے نابود ہوگیا تھا لیکن شیعیت میں موجود رہا۔ ابن رشد کے بعد خواجہ نصیر الدین طوسی میر داماد اور صدر الدین شیرازی (صدر المتألہین) جیسے بلند پایہ فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے یکے بعد دیگرے فلسفے کا مطالعہ کیا اور اسے ترقی دی۔ اسی طرح دوسرے عقلی علوم کے ماہر بھی آسمان علم پر درخشاں ستارہ بن کر چمکے۔ مثلاً خواجہ نصیر الدین طوسی فلسفی ہونے کے علاوہ ریاضی دان بھی تھے اسی طرح میر جندی بھی ایک سربرآوردہ ریاضی دان تھے۔

شیعہ علماء کی ان تھک کوششوں کی بدولت تمام علوم اور بالخصوص مابعد الطبیعیات اور الٰہیات (یا حکمت الٰہی) نے بیحد ترقی کی۔ اس بات کا اندازہ نصیر الدین طوسی، شمس الدین ترکہ، میر داماد اور صدر المتالہین کی تصانیف کا ان کے پیشروؤں کی تصانیف سے مقابلہ کرکے لگایا جاسکتا ہے۔ [۴]

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو چیز شیعیت میں فلسفیانہ اور مابعد الطبیعیاتی افکار کی پیدائش کا باعث ہوئی (اور شیعیت کے ذریعہ یہ افکار دوسرے اسلامی مکاتب میں پھیلے) وہ علم

کا وہ بیش بہا خزانہ تھا جو ائمہ اطہارؑ نے مسلمانوں کے لئے چھوڑا تھا۔ اس طرز فکر کی شیعیت میں مسلسل موجودگی اسی علم کے خزانے کی وجہ سے ہے جسے اہل تشیع عقیدت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

اگر ائمہ اطہارؑ کے چھوڑے ہوئے علمی خزانے کا مقابلہ کئی صدیوں سے لکھی گئی فلسفیانہ تصانیف سے کیا جائے تو صورت حال بخوبی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اس مقابلے سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی فلسفے نے ہر قدم پر اس علمی خزانے سے کیسے استفادہ کیا حتیٰ کہ گیارہویں صدی ہجری میں اسلامی فلسفہ اور یہ الہامی گنجینۂ دانش ایک دوسرے سے قریب تر ہو گئے تھے۔ اگر ان میں کوئی فرق رونما ہوا تو وہ فقط فلسفے کے اصولوں کی تعبیر کے بارے میں تھا۔

ممتاز شیعہ فلسفی

ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینی (وفات ۳۲۹ ہجری بمطابق ۹۴۰ میلادی) اہل تشیع میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شیعیت کی روایات کو "اصول" (ہر ایک شیعہ عالم حدیث نے ائمہ اطہارؑ کے اقوال کتابی شکل میں جمع کیے تھے اور اسے "اصل" کا نام دیا تھا) سے الگ کر کے فقہ اور احکام دین کے عنوانات کے تحت ترتیب دیا۔ کلینی کی کتاب کا نام "کافی" ہے اور یہ تین حصوں یعنی اصول، فروع اور متفرق احکام (روضہ) میں منقسم ہے۔ اس میں ۱۶۱۹۹ احادیث درج ہیں اور یہ دنیائے شیعیت میں حدیث کی معتبر اور مشہور ترین کتاب ہے۔ تین اور کتابیں جو "کافی" کی متمم ہیں مشہور فقیہ شیخ صدوق محمد بن بابویہ قمی (متوفی ۳۸۱ ہجری بمطابق ۹۹۱ میلادی) کی کتاب "من لایحضر الفقیہ" اور شیخ محمد طوسی (متوفی ۴۶۰ ہجری بمطابق ۱۰۶۸ میلادی) کی دو کتب "استبصار" اور "تہذیب الاحکام" ہیں۔

ابو القاسم جعفر بن حسن بن یحییٰ حلی (متوفی ۶۷۶ ہجری بمطابق ۱۲۷۷ میلادی) جو محقق کے لقب سے مشہور ہیں دنیائے فقہ کی ایک مایہ ناز ہستی ہیں اور انہیں عظیم ترین شیعہ

فقیہ تسلیم کیا جاتا ہے ۔ ''مختصر نافع اور شرائع الاسلام'' ان کی شاہکار تصانیف ہیں جو گذشتہ سات سو سال سے شیعہ فقہاء کی رہنمائی کر رہی ہیں۔

محقق کے بعد شہید اول محمد بن جمال الدین مکی عاملی کا نام آتا ہے جنہیں ۷۸۶ ہجری (بمطابق ۱۳۸۴ میلادی) میں شیعہ ہونے کے جرم میں دمشق میں قتل کر دیا گیا ۔ ان کے فقہی شاہکاروں میں سے ایک ''لمعۂ دمشقیہ'' ہے۔ یہ کتاب انہوں نے قید خانے میں سات دن میں لکھی۔

ان کے علاوہ یہاں شیخ جعفر کاشف الغطاء کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو ۱۳۲۷ ہجری (بمطابق ۱۹۰۹ میلادی) میں فوت ہوئے ۔ ان کی مایہ ناز فقہی تصانیف میں سے ایک کا نام ''کتاب کشف الغطاء'' ہے۔

خواجہ نصیر الدین طوسی (متوفی ۶۷۲ ہجری بمطابق ۱۲۷۴ میلادی) وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ''کلام'' کو ایک مکمل علم کی شکل دی ۔ اس موضوع پر ''تجرید الکلام'' نامی کتاب ان کا شاہکار ہے جو گزشتہ سات سو سال سے اس شعبہ میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اہل سنت اور اہل تشیع نے اس کی بہت سی شرحیں لکھی ہیں۔ علم کلام میں ید طولیٰ رکھنے کے علاوہ وہ فلسفہ اور ریاضی میں بھی بہت ممتاز مقام کے مالک ہیں۔ علاوہ ازیں مراغہ کی رصد گاہ بھی انہیں کی کوششوں سے وجود میں آئی۔

صدر الدین شیرازی، (متوفی ۱۰۵۰ ہجری بمطابق ۱۶۴۰ میلادی) جو ملا صدرا اور صدر المتألہین کے ناموں سے مشہور ہیں، وہ پہلے فلسفی ہیں جنہوں نے اسلام میں فلسفے کی صدیوں کی ترقی کے بعد فلسفیانہ مسائل کی بحثوں میں مکمل نظم اور ہم آہنگی پیدا کی۔ انہوں نے ان مسائل کو ریاضی کے مسائل کی طرح ترتیب دیا اور ساتھ ہی ساتھ فلسفے کو عرفان سے منسلک کر دیا جس سے بڑے اہم نتائج برآمد ہوئے۔ انہوں نے فلسفیانہ بحث کی نئی راہیں کھولیں اور بہت سے ایسے مسائل حل کیے جو ارسطو کے فلسفے سے حل نہ ہو سکتے تھے۔ انہوں

نے کئی ایک عارفانہ مسائل کا تجزیہ کر کے انہیں حل کیا جو اس وقت تک لاینحل اور عقلی فکر سے بالاتر سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے دین کے ظاہری مآخذ اور ائمہ اہل بیتؑ کے عمیق الٰہیاتی ارشادات میں موجود علم و دانش کے کئی ایسے جواہر پاروں کی وضاحت کی جو صدیوں سے معما بنے ہوئے تھے اور اکثر خیال کیا جاتا تھا کہ ان کی نوعیت مجازی ہے یا وہ مبہم ہیں۔ یوں انہوں نے عرفان، فلسفہ اور دین کے ظاہری پہلو میں ہم آہنگی پیدا کر دی اور وہ ایک راہ پر چلنے لگے۔

ملا صدرا نے جس طریقے کو ترقی دی اس کی بدولت وہ حرکت جوہر یہ کو ثابت کرنے اور بعد (لمبائی، چوڑائی اور گہرائی) کے ساتھ وقت کا گہرا تعلق ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ وہی بات ہے جسے طبیعیات میں بعد چہارم کا نظریہ کہا جاتا ہے اور جو نظریہ اضافیت (یعنی ذہن میں نہیں بلکہ ذہن سے باہر کی دنیا میں اضافیت) اور دوسرے کئی مشہور نظریات سے ملتا جلتا ہے۔ ملا صدرا نے تقریباً ۵۰ رسالے اور کتابیں لکھیں۔ ان کے عظیم شاہکاروں میں سے ایک ''اسفار'' نامی کتاب ہے جو چار جلدوں میں ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ملا صدرا سے پہلے بھی کئی ایک حکماء نے (مثلاً شیخ سہروردی نے جو چھٹی صدی ہجری کے فلسفی اور حکمت الاشراق کے مصنف ہیں اور شمس الدین ترکہ نے، جو آٹھویں صدی ہجری کے فلسفی ہیں عرفان، فلسفہ اور ظواہر دینی کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کام کی تکمیل کا سہرا ملا صدرا کے سر ہے شیخ مرتضیٰ انصاری شوستری (متوفی ۱۲۸۱ ہجری بمطابق ۱۸۶۴ میلادی) نے اصول فقہ کو نئی بنیادوں پر استوار کیا اور اس کے عملی اصول وضع کیے۔ ایک صدی سے زیادہ عرصے سے شیعہ علماء ان کے مکتب فکر کی پوری مستعدی سے تقلید کر رہے ہیں۔

تیسرا طریقہ: کشف

انسان اور درکِ عرفان

اگر چہ لوگ زیادہ تر تلاش معاش میں مصروف رہتے ہیں اور روحانی معاملات کی

جانب کم توجہ دیتے ہیں تاہم قطعی حقیقت کو پہنچانے کی خواہش ہر انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ بعض لوگوں میں یہ خوابیدہ قوت بیدار ہو کر بالکل ظاہر ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں انہیں کئی ایک روحانی ادراکات حاصل ہوتے ہیں۔

سوفسطائیوں اور منکرین مذہب کے اس دعوے کے باوجود کہ ہر سچائی اور حقیقت ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ ہر شخص ایک ابدی حقیقت پر ایمان رکھتا ہے۔ اکثر جب انسان صاف دل اور پاک روح کے ساتھ کائنات اور مخلوق پر محیط ابدی حقیقت پر نگاہ ڈالتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دنیا کے گوناگوں اجزاء کی ناپائیداری کا مشاہدہ کرتا ہے تو اسے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ دنیا اور اس کے مظاہر ایسے آئینے ہیں جن میں ابدی حقیقت کا جمال منعکس ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے ادراک سے مشاہدہ کرنے والے کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ وہ ہر دوسری خوشی کو اس کے دل سے محو کر دیتی ہے اور ہر دوسری چیز اس کی نگاہوں میں ہیچ اور بے وقعت ہو جاتی ہے۔

یہ نظارہ اہل عرفان کا وہی جذبہ ہے جو خدا شناس لوگوں کی توجہ ماورائے ادراک دنیا کی طرف مبذول کراتا ہے اور ان کے دل میں اللہ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اس کشش کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں اور ان کے دل سے مختلف خواہشیں معدوم ہو جاتی ہیں۔ یہ کشش انسان کی رہنمائی اس غیر مرئی ذات خداوندی کی پرستش اور حمد کی جانب کرتی ہے جو در اصل سب مرئی اور مسموع اشیاء سے زیادہ روشن اور آشکار ہے۔ درحقیقت یہ باطنی کشش ہی ہے جس نے دنیا میں بہت سے ایسے مذاہب پیدا کئے ہیں جن کی بنیاد خدا کی پرستش پر ہے۔ عارف وہ ہے جو اللہ کی عبادت جزا کی امید یا سزا کے خوف کی بنا پر نہیں بلکہ اس کا علم رکھتے ہوئے اس سے محبت کی وجہ سے کرتا ہے۔[۶]

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ عرفان کو دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں بلکہ تمام مذاہب کا دل سمجھنا چاہئے۔ عرفان عبادت کا ایک کامل تر راستہ ہے

جس کی بنیاد خوف ورجا پر نہیں بلکہ محبت پر ہے۔ یہ دین کی ظاہری صورت اور عقلی فکر سے مطمئن رہنے کے بجائے دین کے باطنی حقائق کو سمجھنے کا راستہ ہے۔ ہر الہامی مذہب کے پیروؤں میں حتیٰ کہ ان مذاہب کے ماننے والوں میں بھی جو بت پرستی کے قائل ہیں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عرفان کی راہ پر چلتے ہیں۔ مشرکانہ مذاہب اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور اسلام سبھی کے پیروؤں میں ایسے اشخاص ہیں جو عارف ہیں۔

اسلام میں عرفان کا ظہور

رسول اکرمؐ کے صحابہ میں سے حضرت علیؑ عرفانی حقائق اور روحانی زندگی کی منازل کے فصیح بیان کے لئے مشہور ہیں۔ اس موضوع پر آپ کے ارشادات علم ودانش کا لازوال خزانہ ہیں۔ دوسرے صحابہ کے اقوال جو ہم تک پہنچے ہیں ان میں اس موضوع پر کافی مواد موجود نہیں۔ تاہم حضرت علیؑ کے رفقاء، مثلاً سلمان فارسی، کمیل ابن زیاد، رشید ہجری، میثم تمار اور اویس قرنی وہ بزرگوار ہیں جنہیں صوفیوں کی اکثریت خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ حضرت علیؑ کے بعد اپنے روحانی سلسلے کی پیشوا مانتی ہے۔

اس گروہ کے بعد کچھ اور حضرات مثلاً طاؤس یمانی، شیبان راعی، مالک بن دینار، ابراہیم ادھم اور شقیق بلخی دوسری صدی ہجری میں منظر عام پر آئے جنہیں لوگ ولی اللہ سمجھتے تھے۔ یہ لوگ برسر عام عرفان اور تصوف کا ذکر کیے بغیر ظاہراً زاہد نظر آتے تھے اور اس حقیقت کو نہیں چھپاتے تھے کہ انہیں پہلے گروہ نے روحانیت سے روشناس کرلیا ہے اور تربیت دی ہے۔

ان کے بعد دوسری صدی ہجری کے اواخر اور تیسری صدی ہجری کے آغاز میں بایزید بسطامی، معروف کرخی اور جنید بغدادی وغیرہ جیسے اشخاص پیدا ہوئے جنہوں نے تصوف کا راستہ اختیار کیا اور کھلے عام تصوف اور عرفان سے اپنے تعلق کا اظہار کیا۔ وہ روحانی بصیرت پر مبنی کچھ باطنی اقوال زبان پر لائے جو ظاہری طور پر مکروہ اور معیوب تھے چنانچہ کچھ فقہا اور متکلمین نے انہیں لعنت ملامت کی اور مجرم قرار دیا لہذا ان میں سے کئی ایک کو قید کیا گیا اور

کوڑے لگائے گئے اور قتل کردیا گیا ہے۔ ے اس کے باوجود وہ گروہ باقی رہا اور تمام مخالفت کے باوجود ان لوگوں نے اپنی اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ یوں عرفان اور طریقت کی نشوونما جاری رہی حتیٰ کہ ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں یہ اپنی وسعت اور قوت کی بلندی پر جاپہنچا۔ اس کے بعد کبھی اس کا زور بڑھ گیا اور کبھی کم ہوگیا لیکن اسکی ہستی برقرار رہی اور اب تک یہ اسلامی دنیا میں باقی ہے۔

اکثر مشائخ عرفان وتصوف جن کے نام تذکروں کی کتابوں میں ملتے ہیں بظاہر سنی مکتب کی پیروی کرتے تھے اور جو طریقت اور تصوف آج کل ہمیں نظر آتا ہے (قرآن وسنت کی تعلیمات سے عاری چند آداب اور رسومات کا مجموعہ) یہ انہی مشائخ کی یادگار کے طور پر باقی ہے اگر چہ بعد میں ان میں سے بعض آداب ورسومات شیعوں میں بھی داخل ہوگئیں۔

مشائخ کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ اسلام میں سیر وسلوک کے کسی پروگرام اور طریقہ کا بیان موجود نہیں ہے بلکہ طریقۂ معرفت نفس وہ طریقہ ہے جسے خود صوفیوں نے ایجاد کیا اور بقول ان کے جس کو اللہ نے اسی طرح قبول فرما لیا جیسے نصرانیوں نے دعوت نصرانیت کے لئے رہبانیت کو مذہب میں داخل کیا تو اللہ کے نزدیک مقبول قرار پائی۔

اس کے باوجود یہ پیشوا اپنا روحانی شجرہ، جو روحانی زندگی میں کسی شخص کے شجرۂ نسب کے مانند ہوتا ہے، اپنے سابقہ پیشواؤں کے واسطے سے حضرت علیؑ سے ملاتے تھے۔ علاوہ ازیں ان کی رویاً اور وجدان کے جو نتائج ہم تک پہنچے ہیں وہ بیشتر توحید الٰہی اور روحانی زندگی کے ان حقائق کے بارے میں ہیں جو ہمیں حضرت علیؑ اور دوسرے ائمہ اہلبیتؑ کے اقوال میں ملتے ہیں۔ یہ حقائق ہمیں نظر آسکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان صوفی پیشواؤں کے کچھ جاذب توجہ اور بعض اوقات نفرت انگیز کلمات کا اثر قبول نہ کریں اور ان کی مجموعی تعلیمات کا مطالعہ غور وخوض اور صبر وسکون سے کریں۔

۱۔ روحانی مسلک پر گامزن ہونے سے پیدا ہونے والا تقدس۔۸ جسے صوفی انسان

کا کمال قرار دیتے ہیں ایک ایسی کیفیت ہے جس کا۔ اہل تشیع کے عقیدے کے مطابق امام مکمل طور پر حامل ہوتا ہے اور اس کے وجود کی نور افشانی کے ذریعے یہ کیفیت اس کے سچے پیرو بھی حاصل کرسکتے ہیں۔

ب۔ صوفیا کے روحانی قطب ۹ کی ہر دور میں لازمی موجودگی کا عقیدہ اور اس سے منسوب صفات بھی شیعوں کے عقیدۂ امامت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ اہلبیت رسولؐ کے قول کے مطابق امام۔صوفیاء کی زبان میں۔ایک آفاقی انسان، اسمائے الٰہی کا مظہر اور لوگوں کی زندگیوں اور اعمال کا رہنما ہوتا ہے لہذا اہل تشیع کے ولایت کے تصور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روحانی زندگی اور ولایت کے مآخذ کے لحاظ سے صوفی اکابر شیعہ ہیں۔ اگرچہ دین کی ظاہری صورت کے لحاظ سے وہ سنی مکتب کی پیروی کرتے ہیں۔مطلب یہ ہے کہ اہل تشیع کو امام معصوم کے پیرو ہونے کی وجہ سے وہ تمام چیزیں حاصل ہیں جو اہل تصوف بتاتے ہیں۔ اس کے برعکس خود اہل تصوف جس قطب اور انسان کامل کا تصور پیش کرتے ہیں وہ شیعی دنیا کے علاوہ کہیں وجود خارجی نہیں رکھتا۔ ہاں۔ ماننا'' اور'' تصور کرنا'' اور چیز ہے ور ''ہونا'' اور''پانا'' اور چیز ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اہل سنت کی مستند کتابوں میں بھی بعض اوقات یہ کہا گیا ہے کہ شریعت کی ظاہری شکل وصورت اور تعلیمات کے ذریعے طریقت کے روحانی مسلک ۱۰ یعنی اس طریق کی وضاحت ممکن نہیں جس کا اہل تصوف دعویٰ کرتے ہیں۔ اس کے برعکس صوفیاء کا دعویٰ ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں نے انفرادی طور پر بعض ایسے طریقے اور دستور دریافت کرلیے ہیں جنہیں اللہ نے قبول فرمالیا ہے جیسے کہ اس نے نصرانیت میں رہبانیت کو قبول کرلیا ہے ۱۱ لہذا مشائخ طریقت میں سے ہر ایک نے جو آداب ورسوم درست سمجھے انہیں سیر وسلوک کے پروگرام میں شامل کردیا ہے اور اپنے مریدوں کو اس پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیا اور بتدریج ایک وسیع اور مستقل پروگرام وجود میں آگیا۔ مثلاً

اطاعت وتلقین ، ذکر وخرقہ اور موسیقی وغنا کا استعمال اور ذکر کے موقع پر وجد اور حال اور بعض سلسلوں میں نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ شریعت اور طریقت نے دو مختلف راستے اختیار کیے اور اس روش پر چلنے والے عملی طور پر باطنیہ کے ساتھ ملحق ہوگئے لیکن شیعہ نقطہ نظر کے مطابق جو کچھ اسلام کے اصلی مدارک (کتاب وسنت) سے پتہ چلتا ہے وہ اس کے برعکس ہے اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ دینی بیانات اس حقیقت کی جانب رہنمائی نہ کریں یا بعض پروگرام واضح کرنے میں کوتاہی برتیں یا کسی شخص کے لئے (خواہ وہ کوئی بھی ہو) اپنے واجبات اور محرمات کو نظر انداز کردیں۔

عرفان کی وضاحت:

خداوند عالم نے قرآن مجید میں انسان کو کئی جگہ حکم دیا ہے کہ کتاب اللہ میں غور کرے اور یہ کوشش جاری رکھے اور اس کے مندرجات کو محض سطحی طور پر سمجھنے پر اکتفا نہ کرے۔ بہت سی آیات میں کائنات اور تمام تر مخلوق کو اللہ تعالیٰ کی نشانیاں (آیات) قرار دیا گیا ہے۔ آیت اور نشانی جیسے الفاظ کے معانی کے بارے میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف اشیاء کو یہ نام اس لئے دیے گئے ہیں کہ یہ خود اپنے آپ کو اس قدر ظاہر نہیں کرتیں جتنی اپنے علاوہ ایک اور حقیقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً جب انسان ایک دفعہ سرخ روشنی کو خطرے کے نشان کے طور پر دیکھ لیتا ہے تو پھر اس کے دماغ پر خطرے کا خیال چھا جاتا ہے اور وہ سرخ روشنی پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اگر وہ روشنی کی شکل وماہیت اور رنگ کی طرف توجہ دینے لگے تو پھر اس کے دماغ میں خطرے کا تصور پیدا ہوجانے کے بجائے بتی کی شکل، اس کے شیشے اور رنگ کا تصور پیدا ہوگا۔ اسی طرح اگر کائنات اور اس کے مظاہر ہر لحاظ سے خالق کائنات کی نشانیاں ہیں تو پھر وہ آزاد وجود کے حامل نہیں ہیں۔ ہم خواہ انہیں کسی زاویہ نگاہ سے دیکھیں وہ اللہ کے سوا کسی چیز کی طرف نشاندہی نہیں کرتیں۔ جو شخص قرآن مجید کے زیر ہدایت دنیا اور اہل دنیا کو اس زاویہ نگاہ سے دیکھے وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کا ادراک نہیں کرتا۔ اس مستعار حسن

کو دیکھنے کے بجائے جسے لوگ دنیا کے دلکش خدوخال میں دیکھتے ہیں وہ ایک بے پایاں حسن کو دیکھتا ہے وہ ایک ایسے محبوب کو دیکھتا ہے جو اپنا جلوہ دنیا کی تنگنائی سے دکھاتا ہے۔ بلاشبہ جیسا کہ سرخ روشنی کی مثال میں بتایا گیا ہے جو چیز نشانیوں میں دیکھی جاتی ہے وہ دنیا نہیں بلکہ دنیا کے خالق کی ذات ہے۔ ایک خاص نقطہ نگاہ سے اللہ اور دنیا کے مابین رشتہ (۱+۱) یا (۱×۱) کا نہیں بلکہ (۱+۰) کا ہے (جس سے مراد یہ ہے کہ دنیا اللہ کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور اس کی ذات میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کرتی۔)

جیسے ہی انسان کے دل میں اس حقیقت کا شعور پیدا ہوتا ہے اس کی اپنی علٰحدہ ہستی کا خیال ٹوٹ جاتا ہے اور اچانک اسکے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت جاگزیں ہوجاتی ہے۔ جیسا کہ ظاہر ہے یہ شعور آنکھ، کان یا دوسرے ظاہری حواس کی بدولت یا تخیل یا دماغ کی قوت کے ذریعے پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ تمام اعضاء بجائے خود نشانیاں ہیں اور جس روحانی ہدایت کا یہاں ذکر ہورہا ہے۔ اس کے لئے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ۱۲

جس شخص کی رسائی جلوۂ الٰہی تک ہو اور جو فقط اللہ کو یاد رکھنا چاہتا ہو اور باقی سب کچھ بھلا دینا چاہتا ہو جب وہ یہ سنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں ایک اور مقام پر فرماتا ہے۔

"اے ایمان والو! تم اپنے نفسوں کے خود ذمہ دار ہو۔ اگر تم راہ راست پر ہو تو کوئی گمراہ شخص تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" (سورہ مائدہ آیت ۱۰۵)

تو پھر وہ سمجھ جاتا ہے کہ وہ واحد شاہراہ جو اس کی مکمل رہنمائی کرسکتی ہے، "خود شناسی" کی شاہراہ ہے۔ اس کا سچا رہنما جو خود اللہ تعالیٰ ہے اسے اس بات کا پابند بناتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سمجھے۔ تمام دوسرے راستے چھوڑ کر خود شناسی کا راستہ تلاش کرے، اللہ تعالیٰ کو اپنی روح کے دریچے سے دیکھے اور یوں اپنی تلاش کا حقیقی مقصد پالے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا ہے۔

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔" ۱۳

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

''تم میں سے وہ لوگ اللہ کو بہتر پہچانتے ہیں جو اپنے آپ کو بہتر پہچانتے ہیں۔''[۱۴]

جہاں تک سیر و سلوک کا یہ راستہ اختیار کرنے کا تعلق ہے قرآن مجید کی بہت سی آیات ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے کی تاکید کرتی ہیں، مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا ہے۔

''مجھے یاد کرو اور پھر میں بھی تمہیں یاد کروں گا۔'' سورہ بقرہ آیت ۱۵۲)

انسان کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ نیک اعمال کرے جن کی وضاحت قرآن مجید اور حدیث میں کردی گئی ہے۔ نیک اعمال کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

''بے شک تمہارے لئے اللہ کا رسول بہترین نمونہ ہے۔''

(سورہ احزاب۔، آیت ۲۱)

یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اسلام ایک مخصوص راہ کو وہ راہ قرار دے جو اللہ کی طرف لے جاتی ہے جب تک وہ تمام لوگوں کو اس راہ سے متعارف نہ کرادے؟ اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اس راہ کے بارے میں بتائے لیکن یہ وضاحت نہ کرے کہ اس پر چلنے کا کیا طریقہ ہے؟

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

''اے رسولؐ! ہم نے تم پر کتاب (قرآن) نازل کی جس میں دین اور دنیا کا واضح طور پر بیان ہے۔'' (سورہ نحل۔ آیت ۸۹)

☆☆☆☆☆

حوالے:

۱۔ ابن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ پہلی جلد کی ابتداء

۲۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ اس سیاق وسباق میں فلسفے کے معنی روایتی فلسفے کے ہیں جو یقین پر مبنی ہے۔ اس سے مراد جدید فلسفہ نہیں ہے جو شک سے شروع ہوتا ہے اور دماغ کو عقل تک

محدود کر دیتا ہے۔

۳۔ان مسائل پر ابن القفطی کی اخبار الحکماء (مطبوعہ لیپزنگ ۱۹۰۳ء) وفیات الاعیان اور حکماء کی دوسری سوانح عمریوں میں سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

۴۔ یہ سب بعد کے زمانے (ساتویں سے گیارھویں صدی ہجری بمطابق تیرھویں سے سترھویں صدی میلادی) کے ممتاز فلسفی ہیں۔ اہل مغرب ان سے تقریباً ناواقف ہیں بجز طوسی کے اور وہ بھی فلسفے کی بجائے ریاضیات کے لئے زیادہ مشہور ہیں۔

۵۔ ارسطو کی طرح سابقہ مسلمان فلسفیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ حرکت چیزوں کے جوہر میں نہیں بلکہ ان عوارض (کم وکیف) میں ممکن ہے۔ ملاصدرا نے اس کے برعکس یہ دعویٰ کیا کہ جب کبھی کوئی چیز حرکت میں شریک ہوتی ہے تو فقط اس کے عوارض نہیں بلکہ اس کا جوہر بھی حرکت کرتا ہے پس چیزوں کے اندر ایسی صلاحیت موجود ہے جن کی بدولت وہ آفاقی ہستی کے بلند مدارج پر پہنچ سکتی ہیں۔ تاہم اس نظریے کو جدید نظریہ ارتقاء سے گڈمڈ نہیں کرنا چاہیے۔

۶۔ امام جعفر صادق علیہ اسلام نے فرمایا ہے: "عبادت کی تین قسمیں ہیں۔ ایک گروہ اللہ کی عبادت خوف کی بنا پر کرتا ہے ور یہ غلاموں کی عبادت ہے ایک اور گروہ اللہ کی عبادت صلے کی خاطر کرتا ہے اور یہ مزدوروں کی عبادت ہے۔ تیسرا گروہ اللہ کی عبادت اس سے محبت اور اخلاص کی وجہ سے کرتا ہے اور یہ آزاد لوگوں کی عبادت ہے یہی عبادت کی بہترین صورت ہے۔" بحار الانوار جلد ۱۵ ص ۔ ۲۰۸۔

۷۔ حکماء کی سوانح حیات پر لکھی گئی کتابیں اور عطار کی کتاب تذکرۃ الاولیاء (مطبوعہ تہران ۱۳۲۱ھ شمسی) اور معصوم علی شاہ کی کتاب "طرائق الحقائق" (مطبوعہ تہران ۱۳۱۸ھ) ملاحظہ کریں۔

۸۔عرفاء کی زبان میں جب عارف اپنے آپ کو فراموش کر دیتا ہے تو فنافی اللہ ہوجاتا ہے اور اللہ کی رہنمائی اور ولایت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

۹۔ عرفاء کہتے ہیں کہ دنیا نے اپنی ظاہری ہستی اللہ کے ناموں سے حاصل کی ہے اور اسی بنا پر وہ اپنا سفر طے کر رہی ہے۔ اللہ کے تمام ناموں کا مصدر اس کا ''مکمل اور اعلیٰ ترین نام'' ہے۔ اس کا اعلیٰ ترین نام آفاقی انسان کا مقام ہے جسے کائنات کا قطب بھی کہا جاتا ہے۔ کائنات کبھی قطب سے خالی نہیں رہتی۔

۱۰۔ اسلام میں روحانی راستے کو سیر و سلوک کہا جاتا ہے اس کے معنی خود انسان کے اللہ کی جانب سفر کرنے کے ہیں۔

۱۱۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے'' رہبانیت ان لوگوں نے (یعنی عیسائیوں نے) خود ایجاد کی تھی ہم نے انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔ انہوں نے یہ طریقہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا مگر اسے صحیح طور پر نبھا نہ سکے۔ (سورہ حدید آیت ۲۷)

۱۲۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

''خدا وہ نہیں جو علم کے احاطے میں آجائے۔ خدا وہ ہے جو دلیل کی رہنمائی اپنی جانب کرتا ہے۔'' (بحار الانوار جلد ۴ ص ۔ ۱۸۶)

۱۳۔ ایک معروف حدیث جس کی سنی اور شیعہ صوفیاء اور عرفاء کی کتابوں میں بالخصوص تکرار کی گئی ہے۔

۱۴۔ یہ حدیث بھی شیعہ اور سنی عرفاء کی کتابوں میں نقل کی گئی ہے۔

وحدانیت خدا

حقیقت امر:

ہر واقعہ اور حقیقت امر کو دنیاوی حقائق میں اگر ہم فرض کریں تو حقیقت امر ہے محدود یعنی فرض یا مفروضہ (سبب وشرط کے وجود کا فرض) کے لحاظ سے وہ وجود کا مالک ہے اور دوسرے مفروضے کی بنیاد پر (عدم سبب وشرائط کا فرض) نتیجہ منفی ہے۔

حقیقت میں وجود کی ایک حد معین ہے جس حد سے باہر وجود نظر نہیں آسکتا لیکن صرف خدا وحدہ لاشریک کی ذات ہے جس کے وجود کے لئے کسی حد یا سرحد کو فرض نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ اس کی واقعیت مطلق ہے وہ بہر صورت ہر جگہ موجود ہے کسی بھی علت وسبب اور شرط کی احتیاج نہیں رکھتا۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ لامحدود امور میں اور لامتناہی موارد میں عدد کو فرض نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ ہر وہ دوسرا جو فرض کیا جائے گا وہ پہلے سے بہتر ہوگا نتیجتاً دونوں محدود اور متناہی ہوں گے اور حقیقت میں ایک دوسرے کو محدود کردیں گے مثلاً اگر ہم کوئی لامحدود اور لامتناہی حجم فرض کرلیں تو اس کے مقابل میں دوسرے حجم کو فرض نہیں کیا جاسکتا اور اگر ہم فرض بھی کرلیں تو دوسرا وہی پہلا ہوگا لہٰذا خدا وحدہ لاشریک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں۔

ذات وصفت:

مثال کے طور پر اگر انسان کو عقلی غور وفکر کا عنوان قرار دیں تو ہم یہ دیکھیں گے کہ انسان ایک ذات رکھتا ہے وہ اس کی انفرادیت انسانیت کا جوہر ہے نیز اسکے علاوہ اس میں چند

صفات بھی ہوتی ہیں جن سے اس کی ذات متعارف ہوتی ہے جیسے یہ کہ وہ فلاں شخص کا باپ ہے یا فلاں شخص کا بیٹا ہے، عقلمند ہے توانا ہے بلند قامت ہے خوبصورت ہے وغیرہ وغیرہ یا پھر وہ اس کے برخلاف اوصاف رکھتا ہے۔

یہ صفات اگرچہ ان میں سے اکثر اوصاف جیسے پہلی اور دوسری صفت ہرگز انسان کی ذات سے جدا نہیں ہوتی اور بعض اوصاف جیسے عقلمندی وتوانائی جدا ہونے یا تبدیل ہونے کا امکان رکھتے ہیں لیکن ہر حال میں سب ماسواء ذات ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے سے الگ ہے۔

یہ مطلب (ذات کا صفات سے اور صفات کا دیگر چیزوں سے دوری رکھنے کی) بہترین دلیل ہے اس لئے کہ وہ ذات جو صفت رکھتی ہے اور وہ صفت جو کہ معرفت ذات ہے دونوں لامحدود اور لامتناہی ہیں اس لئے کہ اگر ذات غیر محدود اور لامتناہی ہوگی تو صفات کو بھی اپنے دامن میں لے لیگی اور اسی طرح صفات بھی ایک دوسرے پر محیط ہوجائیں گی نتیجتاً سب ایک ہوجاتے ہیں مثلاً انسان کی ذات اسی قوت وتوانائی سے فرض کی جائے گی، اسی طرح توانائی، عقلمندی، برتری، خوبصورتی یہ سب ایک دوسرے کے مطابق اور ان سب کے معنی ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں گے۔

ان تمام گذشتہ بیانات سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خداوند عزوجل کی ذات کے لئے صفت (گذشتہ معنوں میں) ثابت نہیں کی جاسکتی ہے اس لئے کہ صفت کی ایک حد ہے اور ذات مقدس تعالیٰ ہر حد سے منزہ ہے۔

خداوندی صفات کے معنی:

ہم تخلیق کائنات میں بہت زیادہ کمالات دیکھتے ہیں جو کہ صفات کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں یہ تمام صفات اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ جس جگہ ظاہر ہوتے ہیں اپنے وجود کی قدر وقیمت سے اسے کامل بنادیتے ہیں جیسا کہ ایک زندہ اور موجود انسان اور ایک موجود

بے روح پتھر کے تجزیاتی مطالعہ سے واضح ہوتا ہے۔

بے شک ان کمالات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور اگر وہ خود ان کمالات کا حامل نہ ہوتا تو وہ نہ یہ کمالات کسی دوسرے کو بخش سکتا تھا اور نہ ہی مکمل کرسکتا تھا۔ اس لئے عقل سلیم یہ کہنے پر مجبور ہے کہ خداوند عالم جو خالق کائنات ہے وہ علم اور قدرت رکھتا ہے وہ علم وقدرت اور ہر کمال کا حامل ہے۔

لیکن اس نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ خداوند عالم کی ذات لامحدود اور لامتناہی ہے یہ کمالات جو کہ صفات کی صورت میں ثابت ہوتے ہیں، درحقیقت عین ذات اسی طرح ایک دوسرے کے عین مطابق بھی ہیں اور وہ جدائی جو ذات وصفات اور خود صفات کے درمیان دکھائی دیتی ہے وہ صرف ذہنی مفہوم کی سطح پر ہے حقیقت کے لحاظ سے سواء ایک بسیط واحد کے قابل تقسیم نہیں ہے۔

اسلام اس بے بنیاد اور ناروا اشتباہ سے گریز کے سلسلہ میں (اصل کمال کی توصیف یا نفی کے ذریعہ حد بندیاں) اپنے رہبروں کے عقیدہ کو اثبات ونفی کے درمیان محفوظ رکھتا ہے۔ اور یہ حکم دیتا ہے کہ لوگ بس یہ اعتقاد رکھیں کہ خدا علم رکھتا ہے لیکن دوسروں کے علم جیسا نہیں وہ قادر مطلق ہے مگر دوسروں جیسی قدرت نہیں رکھتا ہے وہ سنتا ہے لیکن اس کے لئے وہ کان کا محتاج نہیں وہ دیکھتا ہے لیکن اسے آنکھوں کی ضرورت نہیں اسی طرح اس کی دوسری حقیقتیں ہیں۔

صفات کے معنی کے سلسلہ میں دیگر توضیحات:

صفات کی دو قسمیں ہیں صفات کامل، صفات ناقص۔ صفات کامل وہ صفات ہیں جن کی طرف اشارہ کیا جاچکا ہے وہ اثباتی مفاہیم ہیں کہ اپنے موضوعات وجود اور ان کے آثار کے زیادہ ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

ایک موجود اور زندہ دانا وعقلمند چیز کا دوسری مردہ اور بے علم وقدرت چیز کے تجزیہ و مقابلہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اور صفات ناقص بالکل اس کے برخلاف صفات کا نام ہے۔

جب ہم ناقص صفات کے سلسلہ میں دقت نظر سے غور وفکر کریں گے تو دیکھیں گے کہ معنی کے اعتبار سے ناقص صفات کمال کے فقدان اور کسی بھی وجود میں قدر وقیمت کے نہ پائے جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے جہل ، عاجزی برائی صحت کا فقدان وغیرہ اور ان جیسی صورتیں۔

اس لحاظ سے جو کچھ گذرا کہ صفات کا ناقص نہ ہونا کامل صفات کے معنی دیتا ہے جیسے نادانی کا انکار دانائی کی علامت ہے اور ناتوانی کا انکار قوی ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

اور اس مقام پر یہ نکتہ بھی قابل بیان ہے کہ قرآن کریم نے ہر کامل صفت کو خداوند عالم کے لئے ثابت قرار دیا ہے اور اس نے ہر ناقص صفت کی نفی کی ہے اور اس کے عکس کو خدا کے لیے ثابت قرار دیا ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: وھو العلیم القدیر، وھو الحی ولاتاخذہ سنة ولانوم ، واعلموا انّکم غیر معجزی اللہ یعنی وہ علیم وقدیر ہے، حی (زندہ) ہے نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند اور یاد رکھو تم اللہ کو عاجز نہیں کرسکتے۔

ایک نکتہ جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ خداوند عالم ایک مطلق حقیقت امر ہے جس کی کوئی حد یا انتہا نہیں۔ اس لحاظ سے ہر کامل صفت جو اپنے مقام کے لحاظ سے ثابت ہے وہ محدود ہونے کا معنی بھی نہیں رکھتی اسے دیت یا جسمانی لحاظ سے یا زمان ومکان کے حساب سے محدود نہیں کیا جاسکتا ہے اور وہ ہر ایسی موجودہ صفت سے منزہ ہے جو حادث ہو اور ہر وہ صفت جو کہ حقیقتاً اس کے لئے ثابت ہے وہ محدودیت اور تخلیہ کے معنی سے تعبیر کی جاتی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے ''لیس کمثلہ شئی'' اس کے جیسی کوئی چیز نہیں۔ سورہ شوریٰ آیت ۱۱

صفات فعل:

اوصاف کی (وہ چیزیں جو گذر چکی ہیں) اسکے علاوہ بھی دو قسمیں ہیں ایک صفات ذات دوسرے صفات فعل۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ کبھی صفت اپنے موصوف کی وجہ سے قائم رہتی ہے جیسے حیات

علم قدرت جو کہ باحیات عقلمند اور قوی انسان سے قائم ہے اور ہم انسان کو تنہا ان اوصاف سے متصف فرض کر سکتے ہیں اگر چہ اس کے علاوہ کوئی دوسری چیز فرض نہ کریں اور کبھی صرف موصوف کے ساتھ قائم نہیں ہوتا اس لئے کہ وہ اس صفت سے متصف نہیں ہوتا حق کا طلب کرنا یہ دوسری بات ہے جیسے لکھنا گفتگو کرنا، کسی کو چاہنا وغیرہ اس لئے کہ انسان کو اس وقت کاتب فرض کیا جاسکتا ہے۔جب اس کے لئے دوات قلم کاغذ جیسی چیزوں کو پہلے فرض کرلیا جائے اور اس وقت مغز سمجھا جاسکتا ہے جب اس کے لئے سننے والے فرض کئے جائیں اور اس وقت اسے کسی چیز کا طالب فرض کیا جاسکتا ہے جب وہ چیز فرض کرلی جائے اور صرف انسان کو فرض کرلینا ان تمام اوصاف کے تحقیق کے لئے کافی نہیں ہے۔

اس مقام پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ خداوند عالم کے حقیقی صفات جو عین ذات ہیں، تنہا پہلی قسم سے ہوں گے لیکن دوسری قسم جس کے حاصل کرنے میں کوئی دوسرا وسیلہ ضروری ہوتا ہے اور جو کچھ اس کے علاوہ اسکا پیدا کیا ہوا ہے اور وہ صفت جو اپنی پیدائش کے بعد وجود میں آتی ہے وہ خدائے متعال کی صفت ذات اور عین ذات نہیں ہوسکتی۔

وہ صفات جو خدائے متعال کے لئے تخلیق کائنات کے بعد ثابت ہوئے ہیں جیسے پیدا کرنے والا، پالنے والا، زندہ کرنے والا، مارنے والا، روزی دینے والا اور اس طرح کے دوسرے اوصاف یہ عین ذات نہیں بلکہ یہ ذات سے بھی زیادہ ہیں اور یہ فعل کی صفت ہے۔ صفت فعل سے مراد یہ ہے کہ فعل کے صادر ہونے کے بعد صفت کا مفہوم فعل سے اخذ کیا گیا ہو نہ ذات سے جیسے پیدا کرنے والا جو کہ کائنات کی تخلیق اور مخلوقات کی خلقت سے ماخوذ ہے اور مخلوق کے ساتھ اسکی وابستگی ہے نہ خدا کی ذات کے ساتھ کہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ ذات صفت کے ظاہر ہونے کے بعد ایک حال سے دوسرے حال میں بدلتی جائے۔

اہل تشیع دو صفت ارادہ اور کلام کو جس کے معنی ان الفاظ سے ہی سمجھے جاسکتے ہیں (ارادہ کے معنی چاہنا اور کلام کے معنی سے لفظی انکشاف کے ہیں) اسے صفت فعل جانتے ہیں

جبکہ بزرگ اہل سنت اسے علم کے معنی میں تسلیم کرتے ہیں اور اسے صفت ذات میں شمار کرتے ہیں۔

قضاء وقدر:

اس جہان ہستی میں علیت کا قانون معتبر کسی استثناء کے حاکم اور اس قانون کے لحاظ سے اس دنیا کے تمام مظاہر اپنی پیدائش کے لحاظ سے کوئی علت یا سبب سے وابستہ ہیں ان میں کی تمام چیزوں کو فرض کرتے ہوئے (جسے کہ علت تامہ کہا جاسکتا ہے) اس کی پیدائش ضروری ہوجاتی ہے۔ اور اگر تمام چیزوں کا فقدان فرض کرلیا جائے یا ان تمام مظاہر کا پیدا ہونا مفروض معلول کے نتیجے میں ضروری ہے اور جبری اور اگر وہ اسباب نہ ہوں تو محال ہے۔

اس نظریے پر غور وفکر کرنے پر مندرجہ ذیل دو نظریے ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ اگر ایک مظہر خلقت کو اس کی تمام علت تامہ یا علت تامہ کے اجزا کے لحاظ سے دیکھیں تو اس کا تعلق علت تامہ سے جبری ہوگا اور علت تامہ کے اجزاء سے جن کو علت ناقصہ کہا جاتا ہے امکان کی حد تک ہے اس وجہ سے کہ جزوی علت معلول کے وجود کا امکان پیدا کرتی ہے نہ اس کو ضروری اور لازمی بناتی ہے۔

نظام خلقت جس کا ہر مظہر اپنی پیدائش کے لحاظ سے کسی علت تامہ سے وابستگی رکھتا ہے اس نظام ہستی میں ضروری اور لازمی ہونا حاکم ہے اور اس کا پیکر جو حوادث کے ایک لازمی سلسلہ سے تشکیل پایا ہے اس کے ساتھ ساتھ امکان کی صفت بھی اس کے ان اجزاء میں جس کی وابستگی علت تامہ سے نہیں ہے، پائی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیمات میں اسی ضرورت کے حکم کو قضاء الٰہی سے تعبیر کیا ہے کیونکہ اسی ضرورت نے جہان کے تشکیل دینے والے سے اپنا وجود حاصل کیا اور اسی وجہ سے حکم و قضا حتمی ہے جس سے گریز اختیار نہیں کیا جاسکتا یہ عادلانہ نظام جس میں استثناء اور خداوند عالم کا ارشاد ہے (والاله الخلق والامر) یہ سب کے سب اسی کے حکم کے تابعدار ہیں۔

سورہ اعراف آیت ۵۴ ۔ اور پھر دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ۔(اذا قضاء امرا فانما یقول له کن فیکون) اور جب کسی کام کا کرنا ٹھان لیتا ہے تو اس کی نسبت صرف کہدیتا ہے کہ ہوجا بس وہ ہوجاتا ہے۔ سورہ بقرہ آیت ۱۱۷) یا پھر یہ حکم کہ (واللہ یحکم لا معقب لحکمه) اور خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اسکے حکم کا کوئی ٹالنے والا نہیں۔ سورہ رعد آیت ۴۱)

۲۔ علت کے اجزاء میں سے ہر ایک اپنے معلول (اثر) کے لحاظ سے ایک اندازہ اور نمونہ فراہم کرتا ہے اور اثر کی پیدائش مجموعہ کے اندازہ کے مطابق وموافق ہے علت تامہ نے اسکے لئے معین کئے ہیں مثلاً وہ اسباب جو انسان کے دوران تنفس کے وجود کا ذریعہ ہیں وہ مطلقاً تنفس کو ایجاد نہیں کرتے بلکہ ایک اندازہ کے مطابق ایک معین وقت اور شکل میں مجرائے تنفس سے نسیج کو پھیپھڑوں تک پہنچاتے ہیں اور وہ اسباب جو انسان کے دیکھنے کا ذریعہ بنے (اور انسان بھی اس کا جز نہیں) قوت بصارت بغیر قیدوبند کے یقین حاصل نہیں کرلیتی بلکہ بصارت جس کے وسیلوں کے ذریعہ سے ہر جہت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے اسے ایجاد کرتی ہے حقیقت تمام فطرت جہاں اور حوادثات میں جو متفق علیہ ہیں بغیر کسی اختلاف کے جاری ہے۔

قرآن کریم نے اپنی تعلیمات میں اس حقیقت کو قدر کے نام سے یاد کیا ہے اور خداوند عالم جو کہ سرچشمہ تخلیقات ہے اس کی طرف نسبت دی ہے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے(انا کل شئی خلقنا بقدر") بے شک ہم نے ہر چیز ایک مقرر انداز سے پیدا کی ہے سورہ قمر ۴۹ اور پھر ارشاد ہوتا ہے (وان من شئی الاعندنا خزائنه وما ننزله الا بقدر معلوم) اور ہمارے یہاں تو ہر چیز کے بے شمار خزانے (بھرے) پڑے ہیں اور ہم اس میں سے ایک نپی تلی مقدار بھیجتے رہتے ہیں۔ سورہ حجر آیت ۲۱

چنانچہ قضاء الٰہی کے مطابق ہر مظہر قدرت اور ہر وہ حادثہ جو کہ نظام تخلیقات میں اپنا مقام رکھتا ہے واجب الوجود اور غیر قابل اجتناب ہے۔ اسی طرح قدر کے لحاظ سے ہر مظہر قدرت یا حادثہ جو وجود میں آتا ہے ایک اندازہ کے مطابق جو خدا کی طرف سے معین ہے ہرگز

کمتر اور کسی سے زیادہ نہیں ہوسکتا۔

انسان اور اختیار:

ہر وہ کام جسے انسان انجام دیتا ہے وہ دنیا کی تخلیقات کا مظہر ہیں اور ان کی پیدائش تمام مظاہر خلقت کی طرح کسی علت سے وابستگی رکھتی ہے۔اور اس طرح متوجہ ہوتے ہوئے کہ انسان پیداشدہ دنیا کا جز ہے اور کائنات کے دوسرے اجزا سے وجودی ارتباط رکھتا ہے دوسرے اجزاء کو اس کے فعل میں بے اثر نہیں قرار دیا جاسکتا۔مثلاً روٹی کا ایک لقمہ جو انسان کھاتا ہے تو اس فعل کی انجام دہی کے لئے جیسا کہ ہاتھ پیر کام ودہن ،علم وقدرت اور ارادہ جیسے وسائل کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح روٹی کا ہونا اس کا دسترس میں ہونا اور اس کے حصول سے کوئی مانع نہ ہونا اور اس طرح کی دوسری زمانی ومکانی شرطیں اس عمل کی انجام دہی کے لئے لازم ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے مجموعہ اجزاء علت تامہ کی نسبت سے کسی فعل کا ضروری اور لازمی ہونا اس بات سے منافات نہیں رکھتا کہ انسان کی نسبت اس فعل سے جو علت تامہ کا ایک جز ہے وہ امکان کی حد تک ہو۔

انسان کا صاف وشفاف اور سادہ ادراک اس نظریے کی تائید کرتا ہے اس لئے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسان اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنیاد پر اپنے امور مثلاً کھانا پینا آنا جانا ،صحت ومرض بزرگی اور بلند قامتی میں فرق کرتا ہے اور پہلی قسم کو جس کا تعلق انسان کے ارادہ اور خواہش سے ہے وہ اس کو انسان کی اختیار میں سمجھتے ہیں اور اسے امر ونہی کا مقام اور مقام تعریف وتنقید قرار دیتے ہیں ۔ برخلاف دوسری قسم کے جس میں انسان کو مکلف نہیں سمجھا جاتا۔

صدر اسلام میں اہل سنت کے درمیان خاص طور پر انسانی افعال کے سلسلہ سے دو مشہور مذہب تھے ایک گروہ کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کے افعال خداوند کے غیر قابل تغیر وارادہ سے متعلق ہیں اس وجہ سے انسان مجبور محض ہے اور انسان کے ارادہ واختیار کی کوئی قیمت تسلیم نہیں کرتے اور ایک گروہ انسان کو اپنے فعل میں مستقل جانتا ہے اور خدائی ارادہ سے اس کا

تعلق نہیں سمجھتا۔

لیکن تعلیمات اہلبیت جو کہ تعلیمات قرآن کے ظاہر سے مطابقت رکھتی ہے اس کے مطابق انسان اپنے فعل میں مختار ہے لیکن کاملاً آزاد نہیں بلکہ خداوند عالم نے اختیار کے راستے سے فعل کو انجام پانے کا طریقہ معین کیا ہے اور ہماری سابقہ تعبیر کے مطابق خداوند متعال نے مجموعہ اجزاء علت تامہ کے ذریعہ کہ ان میں سے ایک انسان کا ارادہ واختیار ہے فعل کو انجام پانے کا راستہ مقرر کیا ہے اور نتیجتاً اس طرح کی خدائی مشیت کے نتیجہ میں انسان ضروری افعال کے سلسلہ میں بھی مختار ہے یعنی فعل اجزاء علت کے مجموعہ کی نسبت سے ضروری اور اس کے اجزاء کی نسبت جز سے جو کہ انسان اختیاری اور ممکن ہے۔

چھٹے امامؑ فرماتے ہیں نہ جبر ہے اور نہ واگذاری بلکہ یہ دو حکم کے درمیان ایک حکم ہے۔(بحار ج ۳ ص ۵)

آیت اللہ شہید بہشتی وشہید باہنر

اسلام میں توحید کا تصور

توحید ذات:

توحید ایک انقلابی تصور اور عقیدہ ہے جس کے مطابق اس پوری کائنات بسیط کا مالک وخالق ایک ہے جس کی حکومت اور قدرت لامحدود ہے۔ وہی خالق مطلق اور قادر مطلق ہے جو پوری کائنات کا رب ہے۔قرآن میں ارشاد ہوا" (اے رسول) کہہ دو کہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا، نہ اسے کسی نے جنا اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔" (سورہ توحید)

اللہ کے بے مثل ہونے کے معنی:

تمام مفکرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ کے بے مثل ہونے سے مراد وہی توحید ذاتی ہے جس کی جانب فلسفہ وعرفان میں توجہ دی گئی ہے۔

توحید ذاتی کو ان الفاظ میں سمجھا جاسکتا ہے:

جب ہم خداوند متعال کے بارے میں کہتے ہیں کہ" وہ ایک ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایسا ایک ہے جس کا کسی عدد سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یعنی وہ ایک بے مثل ذات ہے جسے اعداد وشمار میں محدود نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس کا ایک ہونا اگر عددی اعتبار سے ہوتا تو ایک کے بعد دوسرے کا تصور ضرور ذہن میں آتا، لہٰذا اس کی یکتائی اس کی ذات میں مضمر ہے اور توحید اس کی ذات کا ایک جز ولاینفک ہے۔ اس طرح اس کی توحید کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کا صحیح تصور ہمارے ذہنوں میں موجود ہو۔ اگر ہم کماحقہ اس کے صحیح معنی سے واقف

ہوجائیں تو آپ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ خدا ایک ہے اور اس کی توحید اعداد و شمار پر مشتمل نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات دو عدد یا تین عدد ہونے سے مطابقت نہیں رکھتی۔

فرض کیجئے کہ ہم فضا میں ایک لکیر کھینچیں اور اسے دونوں جانب اتنا طول دیں جس کی کوئی حد نہ ہو پھر اسی کے متوازی Parallel ایک اور خط کھینچیں اور فرض کریں کہ دونوں جانب اس کی لمبائی بھی لامحدود ہو اور اس کا پہلے خط سے ایک میٹر کا فاصلہ ہو۔ کیا ان دو خطوط کے ایک دوسرے سے ایک میٹر کے فاصلے پر واقع ہونے میں ہمیں کوئی دشواری نظر آتی ہے؟ ہر گز نہیں۔ اسی وجہ سے متوازی خطوط کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ کہ "دو خطوط کو اس وقت متوازی کہا جائے گا جیسے ان پر واقع ان تمام نقطوں کا فاصلہ جو ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں مساوی ہو۔ یہ دونوں خطوط خواہ لامحدود ہی کیوں نہ ہوں، یہ کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملیں گے۔

اب ہم ایک ایسا جسم فرض کریں جو ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے تمام اطراف یعنی لمبائی چوڑائی، اور اونچائی میں پھیل جاتا ہے اور ہر طرف بے حد وحساب پھیلتا ہی چلا جاتا ہے؟ کیا اسکے بالمقابل ہم ایک دوسرا جسم بھی فرض کرسکتے ہیں جو لامحدود طور پر پھیلا ہوا ہو؟ ہر گز نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ جو پہلا جسم ہم نے فرض کیا ہے ہمارا وہی فرض فضا کو پر کردیتا ہے اور کسی دوسرے محدود یا لامحدود جسم کے لئے جگہ باقی نہیں چھوڑتا۔ ماسوا اس صورت کے کہ دوسرا جسم خود پہلے جسم میں حلول کر جائے۔ لیکن کیا ایک جسم کا دوسرے جسم میں حلول کرجانا ممکن ہے؟ لہذا ہم فضائے بسیط میں دو ایسے اجسام تصور نہیں کرسکتے جو ہر طرف سے لامحدود ہوں بلکہ جو جسم فضا میں موجود فرض کیا جائے گا وہ پہلا جسم ہی ہوگا۔

جو کچھ اوپر کہا گیا وہ ایک لامحدود جسم کو فرض کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔ جس کا فرض کرنا خود بخود ایک دوسرے لامحدود جسم کے فرض کرنے کی نفی کرتا ہے لیکن اس پہلے جسم کا فرض کرنا کسی ایسی لامحدود چیز کی موجودگی کی نفی نہیں کرتا جو جسم نہ رکھتی ہو۔ مثلاً لامحدود روح)

اور لامحدود جسم میں حلول کر گئی ہو۔

اب معائی کو ایک ایسی چیز کے بارے میں وسعت دیجئے جو ہر اس سمت اور ان تمام سمتوں میں جو ایک وجود رکھنے والی چیز کے لئے فرض کی جاتی ہیں لامحدود ہو۔ کیا ایک ایسی چیز کے دو یا کئی حصے فرض کئے جاسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اس کے دو حصے فرض کئے جائیں تو ان میں سے ایک حصے کو دوسرے سے جدا ہونا چاہئے اور اس بنا پر ان میں سے ہر ایک حصہ دوسرے کی حد ہوگا اور اس بنا پر ان میں سے کوئی بھی لامحدود نہ رہے گا۔ پس خداوند متعال کی ذات بے مثل و بے ہمتا ہے اور وہ ایک ایسی ذات ہے جو اصولاً دو یا چند حصوں میں تقسیم نہیں ہوسکتی۔

خدا شناسی کی راہ میں ایک قدم آگے:

اب تک ہم اپنی دوررس قوت شناخت کی بدولت اس قابل ہوئے ہیں کہ خالق کی ہستی کے یکتا و بے مثل ہونے کی حقیقت سے آگاہ ہوسکیں اور یہ سمجھ سکیں کہ اسی ذات ہستی کا سرچشمہ اور ہمیں ہستی بخشنے والی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا انسان کے لئے اللہ کے بارے میں سوجھ بوجھ کی یہ آخری حد ہے یا وہ اتنی قدرت رکھتا ہے کہ خدا شناسی کے سلسلے میں ایک قدم آگے بڑھائے اور ہستی کے اس سرچشمے کے بارے میں مزید علم حاصل کرے۔

بعض مفکرین کی رائے ہے کہ ''مبدا شناسی'' کے سلسلے میں انسان کی رسائی فقط ایک شناخت'' تک ہے اور وہ بھی یہ کہ ''دنیا کا ایک مبدا'' اور ہستی کا ایک سرچشمہ ہے۔'' لیکن اس مبداء کے بارے میں کوئی شناخت یا سمجھ بوجھ انسانی دسترس سے باہر کی چیز ہے۔ ان مفکرین کے مطابق ہر وہ نام اور ہر وہ صفت جو خالق کی توضیح کے لئے استعمال کی جائے اگر اس کا مفہوم اور معانی اس شناخت سے پیش تر ہوں تو وہ نام اور صفت اس لحاظ سے ''اس'' سے مکمل طور پر بیگانہ ہوگی اور عین ممکن ہے کہ وہ ''مبداء شناسی'' کے سلسلے میں انسان کو غلط راستے پر

ڈال دے۔ اس نظریہ کے مطابق ''مبداء شناسی'' کی بلند ترین منزل بس یہی ہے کہ:

''میں جانتا ہوں کہ وہ ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ انسان کی سوجھ بوجھ سے بالاتر ہے۔''

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم

وزہر چہ گفتہ اندوشنیدیم وخواندہ ایم

(اے وہ ذات جو خیال، قیاس، گمان اور وہم سے اور اس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اور جو کچھ ہم نے پڑھا اور سنا ہے اس سے برتر ہے)

لہٰذا ''مبداء شناسی'' مبداء کے وجود کا یقین ہوجانے کے بعد فقط ایک سمت میں آگے بڑھتی ہے اور وہ سمت یہ ہے کہ اسے ان تمام مفاہیم سے جو ہمارے ذہن کے ساختہ وپرداختہ ہیں برتر سمجھا جائے۔

ان مفکرین کے نظریہ کی قدر وقیمت:

جو نظریہ ان اہل دانش نے پیش کیا ہے وہ اس لحاظ سے بہت پرکشش اور قابل قدر ہے کہ وہ خداوند عالم کی ذات کو ان بے جا اور موہوم خیالات سے برتر اور مبرا قرار دیتا ہے جو خداشناسی کے سلسلے میں انسان میں سماگئے ہیں لیکن اگر اس نظریہ کو حقیقت پسندی کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان دانشوروں کا جھکاؤ افراط کی جانب ہے کیونکہ اگر انسان ''خداشناسی'' کے بارے میں اتنا بے بس ہو کہ اسے فقط ''وہ'' یا ''ھو'' کے لفظ یعنی ''ابہام مطلق'' سے یاد کرتا ہو تو پھر اسے اس ذات کے ''واقعی ہونے'' کا علم کیونکر ہوا!؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ممتاز مفکرین نے جنہوں نے مذکورہ بالا نظریہ پیش کیا ہے کامل او رہمہ جانب شناخت کو اضافی شناخت سے خلط ملط کردیا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی چیز میں ایسی متعدد علامات ہوں، جو ہماری سوجھ بوجھ کے مطابق، اسے دوسری چیزوں سے ممتاز کرتی ہوں۔ اس صورت میں ہم اس چیز کی جس خصوصیت سے آگاہ ہوں اس کے ذریعے ہم اسے دوسری چیزوں سے

الگ پہچان سکتے ہیں ۔محض خدائے تعالیٰ کے بارے میں نہیں بلکہ دوسری چیزوں کے بارے میں بھی ہمارا قاعدہ یہی ہے۔ اگر آپ کے دو بیٹے ہوں تو آپ انہیں بڑی آسانی سے ایک دوسرے سے الگ پہچان سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا آپ ان کی تمام جسمانی اور روحانی خصوصیات سے واقف ہیں؟

لہٰذا اگر اللہ تعالیٰ کی شناخت سے مراد اس کی کامل پہچان ہو تو ہمیں یہ اعتراف کرلینا چاہئے کہ اس قسم کی پہچان انسان کے بس کے باہر کی چیز ہے اور اس کا ذھن اس معاملے میں عاجز ہے۔

(اگر گھاس پھوس سمندر کی تہہ تک پہنچ سکتی ہے تو عقل بھی اس کی یعنی خدائے تعالیٰ کی اصل تک رسائی حاصل کرسکتی ہے؟)

اور اگر بات کسی ایک یا چند جہات میں پہچان کی ہو تب البتہ انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس قسم کی سوجھ بوجھ رکھتا ہو تا کہ وہ اس کے وجود کو سمجھ سکے اور اصولاً اس طرح کے علم کے بغیر خدا کے بارے میں گفتگو ہی بے معنی ہے۔

لہٰذا خدا کی کامل معرفت سے عجز کا اعتراف کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اس حقیقت کی ہر قسم کی شناخت سے معذوری کا اظہار کریں۔ ''شناخت مطلق'' اور'' مطلق بے شناختی'' کے درمیان ایک وسطی حد بلکہ کئی وسطی حدیں ہیں جن کے معنی یہ ہیں کہ ہم اسے کئی جانب سے جان سکتے ہیں۔

انسان کے علم اور اس علم کی قدر و قیمت کے حدود کے بارے میں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس جہان طبیعت کے بارے میں بھی اس کے علم کی حیثیت مطلق یعنی ''طبیعت کے اصل کی پہچان'' کی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کی سائنٹفک فطرت شناسی اصولی طور پر چیزوں کی ذات اور جوہر پہچاننے کی بجائے مظاہر کی پہچان پر توجہ دیتی ہے ۔ مبداء شناسی کے سلسلے میں بھی انہی حدود میں رہ کر مطالعہ کرنا مقصود ہے۔

لہٰذا ایک باشعور انسان ذات خدا کے بارے میں غور وفکر کرتا ہے تو صدق وصفائی سے کہہ اٹھتا ہے کہ:

"ندانم چہ ای" "ہر چہ ہستی توئی"

(مجھے نہیں معلوم کہ تو کیا ہے، جو کچھ بھی ہے بس تو ہے)

لیکن وہی انسان جب خدائے تعالیٰ کو آیات یعنی مظاہر وعلامات کے آئینے میں دیکھتا ہے اور اس کی مخصوص نشانیوں میں سے چند ایک کے بارے میں آگاہ ہوجاتا ہے تب وہ "اس" کے بارے میں ایک قسم کی پہچان حاصل کرلیتا ہے۔ اس "پہچاننے" اور "مطلق نہ پہچاننے" میں بہر حال کافی فاصلہ ہے اور یہ پہچاننا اسے اس قابل بنادیتا ہے کہ "اس کے" بارے میں قطعیت کے ساتھ گفتگو کرسکے۔

لہٰذا یوں کہنا چاہئے کہ جو شخص خدائے تعالیٰ کے وجود پر یقین رکھتا ہو وہ خود بخود "اسے کم ازکم ان صفات کے ساتھ پہچانتا ہے جو اس راستہ سے مطابقت رکھتی ہوں جس راستے سے وہ اللہ کے وجود تک پہنچا ہے اور اسکی خدا شناسی میں کم ازکم خالق رب، مدبر، مبداء اور واجب الوجود وغیرہ جیسی صفات شامل ہوتی ہیں۔

اسماء الحسنٰی

قرآن مجید میں خدائے تعالیٰ کے بہت سے نام اور بہت سی صفات آئی ہیں: "وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔ وہ بڑا مہربان رحم والا ہے۔ وہی خدا ہے جس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ پاک، بے عیب، امن دینے والا، نگہبان، گرانقدر، پرقدرت، بلند پایہ فرمان روا ہے۔ یہ لوگ جس کو اس کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ اس سے پاک ہے وہی خدا تمام چیزوں کا خالق، موجد، صورت بنانے والا ہے اور بہترین نام اسی کے ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اسی کی تسبیح کرتی ہیں اور وہی غالب حکومت والا ہے (سورہ الحشر۔ آیات ۲۲ تا ۲۴)

له الاسماء الحسنیٰ

اللہ کے جو نام اور صفات قرآن مجید میں آئے ہیں ان کا انداز وہی ہے جو اس آیت کے جملے "لہٗ الاسماء الحسنیٰ" (بہترین نام اس کے ہیں) میں بیان ہوا ہے ہر نیکی اور کمال کا ہر جلوہ جس کے بارے میں انسان سوچ سکتا ہے اس کا بلند ترین درجہ خدائے تعالیٰ کے لئے ہے مثلاً قدرت اور مہارت کمال ہے اور خدا ایسا قادر و ماہر ہے جو بلند ترین قدرت رکھتا ہے اور سب کاموں پر قادر ہے۔

---ان اللہ علی کل شی قدیر

بے شک خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ (سورہ العنکبوت ۔ آیت ۲۰)

دانائی بھی کمال ہے اور اللہ تعالیٰ ایسا دانا ہے جو بلند ترین درجے کی دانائی رکھتا ہے وہ ظاہر اور پوشیدہ سے باخبر ہے اور ہر چیز کو جانتا ہے۔

ان اللہ بکل شئی علیم۔

بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ (سورہ التوبہ ۔ آیت ۱۱۵)

عالم الغیب والشھادۃ

وہ پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا ہے (سورہ الرعد ۔ آیت ۹)

کام کا جاننا بھی کمال ہے اور اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور کاموں کو جاننے والا ہے۔

واللہ علیمٌ حکیم۔

اللہ تعالیٰ دانا اور حکیم ہے (سورہ الممتحنہ ۔ آیت ۱۰)

دوسروں پر مہربانی کرنا بھی کمال کی ایک قسم ہے اور الرحمٰن الرحیم یعنی بڑا ہی مہربان اور بہت ہی رحم کرنے والا ہے اور اس سے بھی بڑھ کر وہ ارحم الراحمین یعنی سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔

(سورہ الفاتحہ آیت ۳۔ اور سورہ یوسف ۔ آیت ۶۴)

لہذا خدائے تعالیٰ کا نام لینے میں انسان آزاد ہے اور اسے ان بہترین ناموں میں سے کسی نام سے بھی پکار سکتا ہے۔

(اے رسولؐ) کہہ دیجئے کہ تم اللہ کہو یا رحمٰن جو بھی کہو (یکساں ہے) کیونکہ بہترین نام سبھی اس کے ہیں۔" (سورہ بنی اسرائیل۔آیت ۱۱۰)

"اور سارے بہترین نام اس کے ہیں پس اسے انہیں ناموں سے پکارو اور جو لوگ اسکے ناموں میں کج اندیشی اور کج روی برتتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ دو اور وہ بہت جلد اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔" (سورہ اعراف۔آیت ۱۸۰)

خدائے تعالیٰ چونکہ ہر کمال کا بلندترین مرتبہ رکھتا ہے اس لئے وہ خود بخود ہر قسم کے عیب ونقص اوراحتیاج وضرورت سے پاک ومبرا ہے۔قرآنی آیات کا کچھ حصہ جو خدائے تعالیٰ کی تعریف میں ہے اسی پاکیزگی اور فضیلت پر انحصار کرتا ہے۔

بے نیاز خدا:

قرآن مجید کی گوناگوں آیات کے مطابق خدائے بزرگ وبرتر ہر قسم کی احتیاج اور ضرورت سے بے نیاز ہے۔قرآن خدا شناسی کے سلسلے میں اس "بے نیازی" پر ایک عظیم حقیقت کی شکل میں تکیہ کرتا ہے۔ایک ایسی حقیقت جس کی مدد سے فکر اورعقیدے کی چند ان کج رویوں پر سے پردہ اٹھایا جاسکتا ہے جو خدا کے بارے میں پیدا ہوگئی ہیں۔

وہ اطاعت وعبادت سے بے نیاز ہے:

اورموسیٰ نے (اپنی قوم سے) کہا کہ اگر تم اور روئے زمین کے تمام لوگ مل کر بھی کافر ہوجاؤ تو خدا کو کوئی پرواہ نہیں کیونکہ وہ بے نیاز اور سزاوار حمد ہے (یعنی ہر اس عیب اور نقص سے جو اس کی حمد کے منافی ہو پاک ہے)(سورہ ابراہیم آیت ۸)

خداوند کریم کی بے نیازی پر غور کرنے سے انسان پر یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہم اس پر ایمان لائیں اور اس کی عبادت واطاعت کریں تو یہ خود ہمارے فائدے کے لئے ہے

ورنہ اسے ان چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں

اگر جملۂ کائنات کافر گردند
بر دامن کبریائش ننشیند گرد

(اگر تمام کائنات بھی کافر ہو جائے تو اس کی بڑائی کے دامن پر کوئی گرد نہیں جمتی)

زمان و مکان سے آزاد خدا:

خداوند کریم کے ہر قسم کی حاجت سے بے نیاز ہونے سے یہ بات خود بخود لازم ہو جاتی ہے کہ وہ نہ وقت میں سماتا ہے اور نہ جگہ میں۔ وہ ایسی ہستی ہے جو وقت اور جگہ سے برتر ہے کیونکہ جو ہستی جگہ میں سما جائے وہ خود بخود جگہ کی محتاج ہو جاتی ہے اور جو ہستی وقت میں سما جائے وہ ایک ایسی ہستی ہے جو فقط ان خاص حالات میں حقیقت کا روپ اختیار کرنے کے قابل ہے جو ایک معین وقت میں موجود ہوں، یعنی ایک خاص وقت میں قید ہے۔

خدائے دانا:

کائنات کا پیدا کرنے والا ہر چیز سے واقف ہے۔ ہمارے لئے جہاں ہستی دو حصوں یعنی ''غیب'' اور ''شہادت'' یعنی ظاہر اور غائب میں تقسیم ہو جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ اس کے غیب اور شہادت' پوشیدہ اور ظاہر سب کو جانتا ہے اور اصولاً اسکے لئے کسی غیب کا کوئی وجود نہیں بلکہ اس کے لئے سارا جہان ''شہادت'' یعنی ظاہر ہے۔

عالم الغیب والشھادۃِ الکبیر المتعال

پوشیدہ اور ظاہر کا جاننے والا۔ بزرگ و برتر۔'' سورہ رعد۔ آیت ۹)

خدائے تعالیٰ کائنات کی تمام جزئیات سے واقف ہے حتیٰ کہ وہ ہمارے ایک ایک فعل سے آگاہ ہے:

''وہ ہر اس فعل سے آگاہ ہے جو تم سے سرزد ہوتا ہے (سورہ النحل۔ آیت ۱۹)

خدائے قادر وتوانا:

وہ ہر شئی اور ہر کام پر قدرت رکھتا ہے:

"کہ خدا ہر چیز پر قادر ہے" (سورہ البقرہ آیت ۲۰)

اس کی قدرت اور تسلط کا یہ عالم ہے کہ جب وہ چاہے کہ کوئی چیز وجود میں آجائے یا کوئی کام انجام پا جائے تو اس کا یہ حکم دینا کافی ہے کہ "ہوجا" اور وہ کام فوراً بلا فاصلہ ہوجاتا ہے۔ "جس میں وہ کوئی چیز چاہے تو جونہی وہ حکم دیتا ہے کہ ہوجا تو وہ چیز فوراً ہوجاتی ہے۔" (سورہ یسین ۔آیت ۸۲)

خدائے تعالیٰ کا ارادہ اور مشیت (قضا وقدر):

جو موجودات دانائی اور توانائی سے بہرہ مند ہوں وہ عموماً جو کچھ چاہیں اسے یا کم از کم اسکے ایک حصے کو حقیقت کی شکل دے دیتے ہیں یا کم از کم اسے حقیقت کی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ جب ہم اپنے علم کی بنا پر اپنی خواہش کو حقیقت کی شکل دینے کے قریب پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں کہ: "ہم نے ارادہ کیا ہے کہ فلاں کام انجام دیں" لہذا ارادہ علم پر مبنی قوی ذہنی فیصلہ ہے جو ہماری خواہش کو موثر بنانے میں مدد دے سکے" اس دنیا کے کھا کوں موجودات میں جاندار کم از کم ترقی یافتہ جاندار بھی کم وبیش یہ خصلت رکھتے ہیں کہ جب ان کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوتی ہے تو وہ خوف کے ساتھ اسے حقیقت کی شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن جانداروں کے بارے میں ہمیں اب تک معلومات حاصل ہوئی ہیں ان میں سے انسان کو یہ امتیازات سب سے بڑھ کر حاصل ہے اور سب معلومہ جانداروں سے اس کا دائرہ اختیار اور ارادہ وسیع تر ہے اسی وجہ سے اسکی زندگی میں دوسرے موجودات کی زندگی کے مقابلے میں خالق کے علم وآگاہی کی زیادہ علامات ہیں اس کے باوجود بہت سے ایسے کام جو انسان خود بخود انجام دیتا ہے اور ظاہراً اس کے ارادے کی بنا پر نہیں ہوتے، اس کا گردش خون کا نظام، تنفس کا نظام، ہاضمہ کا نظام اور اس کے جسم کے بڑے اور چھوٹے غدود جو ضروری کیمیائی مواد

پیدا کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ یہ سب اس کے ارادے کے بغیر اپنا اپنا کام انجام دیتے ہیں۔

ان باتوں سے قطع نظر بھی ارادے کی تاثیر کا دائرہ اختیار بہر حال محدود ہے مثلاً اب تک انسانی ارادے نے آسمانی سیاروں کی گردش کے نظام پر اپنا کوئی نقش ثبت نہیں کیا۔ یا مثلاً جو انسان بطن مادر سے جسمانی اور ورثے میں ملنے والی خصوصیات لے کر اس دنیا میں آتا ہے ان خصوصیات پر اس کے علم اور ارادے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

لہٰذا انسانی ارادے اور مرضی کی تاثیر بہر حال محدود ہے اسی بنا پر اکثر ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ انسان کوئی کام انجام دینے کا ارادہ کرتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہوتا ہے اور بعض ایسے عوامل جو اس کی دانائی اور قدرت کے دائرہ میں نہیں آتے اس کام کے انجام پانے میں سدراہ بن جاتے ہیں۔ لیکن خدائے تعالیٰ جو علیم مطلق اور قادر مطلق ہے جو چاہتا ہے سو کرتا ہے۔ کیونکہ تیرا پروردگار جو چاہتا ہے کرتا ہے۔'' (سورہ ھود۔ آیت ۱۰۷)

کوئی چیز اس کے ارادے کے پورا ہونے میں مانع نہیں ہوسکتی۔'' (سورہ ھود۔ آیت ۳۳)

اور اس کی مرضی سارے جہاں پر حکومت اور تسلط رکھتی ہے (قضا) لیکن دوسروں کی مرضی کو ایسی حکومت اور تسلط حاصل ہو۔

دوسرے خواہ کوئی بھی ہوں اسی چوکھٹے اور اپنی حدود میں حرکت کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے کام اور حرکت اور ارادے کے دائرہ اختیار کے طور پر مقرر کردی ہیں۔ (قدرو) (سورہ الطلاق۔ آیت ۳)

اور انسان بھی اسی قاعدہ وکلیہ کے تحت آتا ہے۔ اپنی زندگی کی تعمیر اور اس کے لئے مخصوص سمتوں میں راستوں کا انتخاب کرنے کے لئے اس کی قدرت انہی حدود میں محدود ہے جو اللہ تعالیٰ کی ''قضا وقدر'' نے اس کے لئے مقرر کی ہیں۔ اس نے یہ چاہا ہے کہ انسان اپنی جانچ اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے مستقبل کو اچھا یا برا، روشن یا تاریک بنالے۔ علاوہ ازیں ان حدود میں رہتے ہوئے بھی انسان یا کسی اور ہستی کے لئے یہ درست نہیں کہ اپنے آپ کو ان

حدود میں مطلق اور غیر متنازع فرمانروا تصور کرے کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اور حدود میں بھی انسان کی مرضی کو بے اثر بنا سکتا ہے۔ کیونکہ اکثر اس کا حکم جاری ہوتا ہے۔ اور کسی فریب خوردہ فرد یا گروہ کی کوششوں کے نتیجوں کو یوں برباد کر دیتا ہے کہ کسی کو اس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ایک ایسا عامل ہوتا ہے جو اسی فرد یا گروہ اور دوسرے لوگوں کو خبردار کرتا ہے اور ان پر واضح کر دیتا ہے کہ انہیں چاہیے کہ اپنی قدرت اور اختیار کے دائرے میں بھی ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور ارادے کے سایہ کی جانب توجہ رکھیں جو کہ ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔

واضح مثال:

اس قسم کے واقعات کے کئی نمونے قرآن مجید میں نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں سورہ قلم کی ۱۷ تا ۳۳ آیات بھی ہیں جو براہ راست اس معنی پر روشنی ڈالتی ہیں۔

"جس طرح ہم نے ایک باغ والوں کا امتحان لیا تھا اسی طرح ان کا امتحان لیا۔ جب انہوں نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ صبح ہوتے ہی ہم اس کا میوہ ضرور توڑ ڈالیں گے اور انشاء اللہ نہ کہا تو یہ لوگ پڑے سو ہی رہے تھے کہ خدا کے حکم سے تیز آندھی نے باغ کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ پھر یہ لوگ صبح صبح باہم غل مچانے لگے کہ اگر تم کو توڑنا ہے تو باغ میں سویرے چلے چلو۔ غرض وہ لوگ چلے اور آپس میں چپکے چپکے کہتے جاتے تھے کہ آج یہاں تمہارے پاس کوئی فقیر نہ آنے پائے۔ چنانچہ وہ لوگ روک تھام کے اہتمام کے ساتھ میوہ توڑنے کی ٹھانے ہوئے سویرے ہی جا پہنچے پھر جب اسے اجڑا ہوا دیکھا تو کہنے لگے ہم لوگ تو بھٹک گئے (یہ باغ ہمارا نہیں۔ پھر سوچ کر بولے (بات یہ ہے کہ ہم خدا کی جانب سے (اپنی محنت کے پھل سے فائدہ اٹھانے سے محروم ہو گئے ہیں۔ جو ان میں منصف مزاج تھا کہنے لگا کہ کیوں؟ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے۔ وہ باہم۔ منہ ملامت کرنے لگے۔ آخر سب نے اقرار کیا کہ ہائے افسوس! بے شک ہم خود ہی سرکش تھے امید ہے کہ ہمارا پروردگار ہمیں اس سے بہتر باغ عنایت فرمائے گا ہم اپنے پروردگار کی طرف رجوع کرتے ہیں۔"

قرآن شناسی:

مولانا سید علی محمد نقوی

تفسیر سورہ الحمد

الفاتحہ کا مفہوم تعارف یا افتتاح ہے۔ یہ سورہ بنیادی طور پر مقدمہ قرآن ہے اور اس کا نزول بھی عہد رسالت کے بالکل ابتدائی دور میں ہوا ہے۔ یہ پہلا سورہ ہے جو مکمل نازل ہوا۔ اس سورہ سے پہلے سورہ نمبر ۹۶، ۷۳، اور ۷۴ کی چند ابتدائی آیتیں نازل ہو چکی تھیں۔ یہ تنہا سورہ ہے جو عہد رسالت کے دونوں ادوار یعنی مکی دور اور مدنی دور میں الگ الگ دوبارہ نازل ہوا اور اس طرح مکی اور مدنی دونوں کہلایا۔ اس سورہ کی اہمیت اور فضیلت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی واجب نماز اس سورہ کی قرأت کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ ہر باعمل مسلمان اپنی روزانہ کی واجب نمازوں میں کم سے کم دس مرتبہ اس سورہ کی تلاوت ضرور کرتا ہے۔ اس کی آیتوں کی ترتیب اور الفاظ کی نشست بلند ترین شعری ادب کا نمونہ ہے۔ اس کا صوتی تاثر عربی زبان کا بے مثل انداز اور مضمون کی گہرائی انسان کو معنویت کے اعلیٰ ترین مقامات تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ چھوٹا سا سورہ انسان کی خداوند جلیل کے حضور ایک دعا ہے جسے خالق نے خود تعلیم کیا ہے۔ قرآن چونکہ بنیادی طور پر کتاب ہدایت ہے اور ہدایت خالق کا اپنے بندوں پر ایک کرم ہے لہٰذا یہ کتاب دعا سے شروع ہوتی ہے جس میں انسان اپنے رب سے ہدایت کی درخواست کرتا ہے۔ پورا قرآن درحقیقت انسان کی اسی درخواست کا جواب ہے۔

سورہ فاتحہ کا موازنہ عیسائیوں کی دعای رب'' (Lord's Prayer) سے کیا جاسکتا ہے۔ دونوں کا فرق بہت واضح ہے۔ انجیل کی دعا میں خداوند کریم کو ''پدر'' باپ کے نام سے

یاد کیا گیا ہے جبکہ سورہ فاتحہ اسے ''عالمین کے رب'' سے تعبیر کرتا ہے۔ انجیل کی دعا میں خالق کے لئے ''جو آسمانوں میں ہے'' کی لفظیں استعمال کی گئیں ہیں۔ جبکہ سورہ فاتحہ اسے ''تمام دنیا اور آخرت کا مالک'' کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ انجیل کی دعا میں انسان اپنے رب سے اپنے قرضوں کی ادائگی اور روٹی کا سوال کرتا ہے جبکہ اس سورہ میں انسان صراط مستقیم پر چلنے اور قائم رہنے کی ہدایت کا مطالبہ کرتا ہے۔

یہ سورہ اپنے معنیٰ اور مضمون میں اس قدر جامع ہے کہ اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پورے قرآن کا نچوڑ اس سورہ کی سات آیتوں میں سمویا ہوا ہے۔ سات چھوٹی آیتوں کا یہ چھوٹا سا سورہ درحقیقت اسلام کے تمام بنیادی عقاید کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اس لئے اسے جائز طور پر ''اُم القرآن'' کہا جاتا ہے ۔ یہ سورہ اسلامی طرز فکر کے تمام اجزاء کو صریحاً یا اشارتاً بیان کرتا ہے یہاں ہم کچھ پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جنکا مجمل ذکر اس سورہ میں موجود ہے

تصور خدا:

- اس سورہ میں خداوند تعالیٰ کے چار بنیادی صفات بیان کئے گئے ہیں یعنی خالق' رب' رحیم' اور یوم جزا کا مالک۔اسلام میں یہی تصور خدا ہے یعنی ایسا خدا جس کی قدرت اور حکومت لامتناہی اور جس کا رحم وکرم تمام حدود سے بالاتر ہے۔وہی کائنات کا خالق اور اس کا پالنے والا ہے۔

صفات الٰہی کا بیان :

- رحمانیت ، رحمت اور عدل خداوند عالم کی وہ بنیادی صفات ہیں جن کی طرف اس سورہ میں اشارہ ہے۔

عقیدہ معاد:

اسلام کا دوسرا اہم عقیدہ عقیدہ معاد یا قیامت ہے اس سورہ کے آخر میں اسلام کے

تصور معاد (قیامت) کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ خداوند عالم یوم قیامت کا مالک ہے۔ یعنی ایک دن ایسا ہوگا جب عدل وانصاف کیا جائے گا اور انسان اپنے اعمال کی سزا یا جزا پائے گا اور کوئی بھی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہی اسلام کا تصور معاد یا قیامت ہے۔

عقیدہ توحید:

عقیدہ توحید اسلام کا جوہر ہے۔ اسلامی توحید صرف نظریہ نہیں بلکہ ایک عملی نظام ہے۔ سورہ حمد میں اس کا ذکر ہے۔

- اور کہا گیا ہے کہ انسان کو صرف اللہ کی عبادت کرنی چاہئے اور صرف اس سے مدد کی امید رکھنی چاہئے۔

عقیدہ نبوت وامامت:

- اسلام کے دوسرے بنیادی عقیدے عقیدہ نبوت وامامت میں فلسفہ موت وحیات اور ضرورت ہدایت الٰہی ہے۔ سورہ حمد میں اس کی بنیاد کا تذکرہ ہے اور اس بات پر تاکید کی گئی ہے کہ انسان خدا کی ہدایت کا محتاج ہے۔

نظریہ تولا

- انسان کو اچھوں کے ساتھ رہنا چاہئے اور بروں اور برائی سے نفرت کرنا چاہئے اور ان سے اپنے دامن کو دور رکھنا چاہیے۔

سورہ حمد میں اس اصول کا بھی دعائیہ پیرایہ میں ذکر ہوا ہے۔ اس طرح سورہ حمد میں صرف توحید، معاد، نبوت، امامت، اخلاق اور احکام کی جانب اشارہ نہیں ہے بلکہ انسان اور کائنات کے اسلامی تصور اور اسلامی عملی نظام کی جانب بھی رہنمائی موجود ہے۔ اسی لئے سورہ فاتحہ کو پورے قرآن کا نچوڑ کہا جاتا ہے۔

بسم اللہ کے معنیٰ اور اس کی اہمیت:

"بسم اللہ" سورہ برأت کو چھوڑ کر قرآن کے تمام سوروں کا جزو ہے۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ پیغمبر اکرمؐ پر جب بھی کوئی نیا سورہ نازل ہوتا تھا تو سب سے پہلے آیت بسم اللہ نازل ہوتی تھی بغیر "بسم اللہ" کے یہ علم نہیں ہوتا تھا کہ کوئی نیا سورہ شروع ہوگیا ہے (داؤد) امام جعفر صادقؑ کے ایک صحابی معاویہ ابن عمار کہتے ہیں کہ میں نے ایک دن امام سے سوال کیا کہ کیا مجھے نماز میں سورہ حمد سے پہلے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" کی تلاوت کرنی چاہئے، امام نے فرمایا ہاں" میں نے پھر سوال کیا کہ کیا سورہ حمد کے اختتام اور دوسرے سورہ کے شروع کرنے سے پہلے پھر "بسم اللہ" پڑھنا چاہئے، امام نے پھر فرمایا ہاں۔" دار قطنی نے امیر المومنین سے روایت کی ہے کہ کسی نے آپ سے "سبع مثانی" (سات آیتوں) کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا یہ سورہ حمد ہے۔ اس شخص نے پھر کہا کہ سورہ حمد میں تو صرف چھ آیتیں ہی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ "بسم اللہ الرحمن الرحیم" بھی تو ایک آیت ہے۔

"بسم اللہ" کی اہمیت اور فضیلت کے سلسلے میں امام علی ابن موسیٰ الرضاؑ نے فرمایا: "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اسم اعظم ہے اس طرح ہم سے قریب ہے جیسے آنکھ کی پتلی اس کی سفیدی سے۔ شیخ صدوق نے کتاب "خصائل" میں امام محمد باقرؑ سے روایت کی ہے کہ ہم جب بھی کوئی چھوٹا یا بڑا کام شروع کریں تو ہمیں "بسم اللہ الرحمن الرحیم" سے اس کام کی شروعات کرنی چاہئے۔ اس سے رحمت خدا اس کام میں شامل ہوجاتی ہے۔

روایتوں میں یہ بھی وارد ہوا ہے کہ سورہ حمد پورے قرآن کا نچوڑ ہے، "جو کچھ سورہ حمد میں ہے وہ "بسم اللہ" میں ہے اور جو کچھ بسم اللہ میں ہے وہ باء بسم اللہ میں ہے، جو کچھ باء بسم اللہ میں ہے وہ اس نقطہ میں ہے جو "باء" کے نیچے لگتا ہے اور جو اس حرف کو دوسرے عربی حروف سے جدا کرتا ہے۔" یہ جملہ بہت گہرا ہے اور اس کے عرفانی معانی ہیں۔ اسی لئے

امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ نے فرمایا ''میں وہ نقطہ ہوں جو ''باء'' کے نیچے ہوتا ہے۔''

اگر ہم اس آیۂ مبارکہ پر گہرائی سے غور کریں تو محسوس ہوگا کہ اسلام کا مرکزی پیغام اس ایک جملے میں سمو دیا گیا ہے۔ ہر آئیڈیالوجی اور مکتب فکر کا اپنا ایک نعرہ ہوتا ہے جو اس کے بنیادی پیغام کو پیش کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کے انقلاب کا نعرہ تھا ''برابری آزادی اور اخوت'' جو اس تحریک کے پیغام کی طرف متوجہ کرتا تھا اسی طرح مارکس کی تحریک کا نعرہ تھا ''دنیا کے مزدورو متحد ہوجاؤ۔'' یہ نعرہ اس آئیڈیالوجی کے طبقاتی طرز فکر کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ قرآن کریم کی شروعات ''بسم اللہ'' سے ہوتی ہے جو اسلامی آئیڈیالوجی کے لئے ایک بنیادی شعار کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس آیت سے یہ ثابت ہے کہ اسلامی طرز فکر میں بنیادی حیثیت نہ تو نسل کی ہے نہ رنگ کی نہ ہی طبقہ کی بلکہ ان تمام چیزوں سے بالاتر ذات واجب الوجود اور اس کے مقدس قوانین ہیں جو اس مذہب کی بنیاد ہیں۔ اس طرح '' آیہ بسم اللہ'' اسلامی نظام کا ایک علامتی شعار ہے۔

''بسم اللہ'' سے کام شروع کرنے کی حکمت:

ہر مسلمان کے لئے یہ تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے تمام کاموں کی شروعات '' آیت بسم اللہ'' سے کرے۔ یہ جملہ در اصل خداوند عالم سے مدد کی درخواست پر مبنی ہے۔ اسلام بنیادی طور پر صرف ایک فلسفیانہ نظام نہیں ہے جہاں عمل کی گنجائش ہی نہ ہو بلکہ اس دین میں عقیدہ اور عمل ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ اس لئے آیۂ ''بسم اللہ'' نہ صرف ایک عقیدہ کا اعلان ہے بلکہ ساتھ ہی اس میں عمل کی ترغیب بھی ہے۔

رب العالمین کے حقیقی معنیٰ اور اس کے مختلف پہلو:

رب کے مختلف معنیٰ ہیں جیسے:(۱) مالک، آقا اور صاحب اختیار (۲) پالنے والا، کفیل اور ولی (۳) بادشاہ اور حاکم (۴) وہ جس کی اطاعت واجب ہو (۵) رازق، اور ترقی دینے والا (۶) وہ جو مسلسل کمال کی جانب رہنمائی کرے۔

لفظ ''رب'' خالق اور کائنات کے بیچ رشتے کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔ یہ نہ صرف خلق کرنے اور وجود میں لانے کی جانب اشارہ کرتا ہے بلکہ کائنات کے تکامل اور ترقی پر بھی دلالت کرتا ہے۔ یہ مادی کائنات خود بہ خود پیدا نہیں ہوگئی ہے اور نہ از خود چل رہی ہے۔ اللہ نہ صرف کائنات کا خالق ہے بلکہ اس کا چلانے والا بھی ہے۔ کائنات سے خالق کا رشتہ کوئی گذشتہ واقعہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت ہے۔ ارسطو کے فلسفۂ ''علت اول'' اور اسلامی تصور ''رب العالمین'' میں یہی فرق ہے۔

خداوند نہ صرف خالق ہے بلکہ وہ اپنی مخلوق کو ان میں موجود استعداد کے ذریعہ کمال کی جانب رہنمائی بھی کرتا ہے۔ کائنات کی ہر شئی ہر لحہ ترقی پذیر ہے یہ آیت اس جانب بھی اشارہ کرتی ہے کہ انسان کی ترقی کے امکانات لامحدود ہیں لہٰذا رب العالمین حیات اُخروی میں بھی منازل کمال کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہوا کہ انسان کی روحانی ترقیاں مرگ ظاہری کے بعد بھی جاری رہیں گی۔

لفظ ''اللہ'' کے معنیٰ:

''اللہ'' لفظ الٰہ'' کے ساتھ ''ال'' لگا کر بنایا گیا ہے۔ یہ خدا کا اسم ذات ہے۔ دوسری زبانوں میں اس لفظ کے مساوی جتنے بھی الفاظ پائے جاتے ہیں ان کی جمع اور مؤنث ممکن ہے لیکن لفظ ''اللہ'' کے لئے جمع یا مؤنث ممکن نہیں ہے۔ حالانکہ انگریزی زبان میں ''گاڈ'' یا اردو میں ترجمے کے لئے ''خدا'' کا استعمال کیا جاتا ہے مگر درحقیقت لفظ اللہ کا صحیح ترجمہ کسی بھی زبان میں ممکن نہیں ہے۔

''العالمین'' کے معنیٰ:

''عالمین'' کے کیا معنیٰ ہیں؟ کیا ایک سے زیادہ دنیائیں موجود ہیں؟ کیا اسکے معنیٰ تمام موجودات ہیں؟ کیا اسکے معنیٰ مختلف مخلوقات اور ان کے مراتب ہیں؟ تفسیر ''المنار'' کے مصنف نے اس سلسلے میں امام جعفر صادقؑ سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں امامؑ نے

فرمایا کہ ''عالمین'' سے مراد تمام انسان ہیں۔ شیخ صدوق نے اپنی کتاب ''عیون الاخبار'' میں امیر المومنین حضرت علیؑ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا ''عالمین'' سے مراد تمام مخلوقات ہیں چاہے وہ ذی روح ہوں یا بے جان۔ اگر ہم قرآن کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قرآن کریم میں یہ لفظ مختلف معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کہیں پر یہ تمام مخلوقات یعنی انسان، ارواح، ملائکہ، حیوانات، درخت اور معدنیات کے لئے استعمال ہوا ہے تو کہیں پر محدود معنی میں جیسا کہ آیۂ (۲۵:۲) میں ''العالمین'' سے مراد تمام انسان ہیں۔ کہیں پر اس سے مراد تمام گروہ ہیں۔

اسلام ایک آفاقی دین:

قرآن اپنے آغاز ہی میں یہ بات روز روشن کی طرح واضح کر دینا چاہتا ہے کہ دین اسلام میں ذات خدا کسی ملک یا نسل کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ اسلام کا تصور ''رب'' کسی قبائلی دیوتا یا علاقائی خدا کا تصور نہیں ہے۔ اسلامی نظریئے سے اللہ تمام کائنات اور تمام انسانیت کا مالک اور رازق ہے۔

خالق کی وحدانیت کا لازمی نتیجہ مخلوق کا اتحاد ہے۔ اسلام کی صفات میں ایک مخصوص صفت اس کا آفاقی ہونا ہے۔ دین اسلام یہودیت یا عیسائیت کی طرح کسی خاص قوم یا گروہ کا مذہب نہیں ہے۔ اسلام زرتشتی یا ہندو مذہب کی طرح نسلی مذہب بھی نہیں ہے جو صرف ایک خاص نسل یعنی آریائی نسل کے لئے مخصوص ہو۔ اسی طرح اسلام طبقاتی آئیڈیالوجی (مثلاً مارکس ازم کی طرح) بھی نہیں ہے جو صرف ایک خاص طبقہ کے لئے مخصوص ہے۔ اسلام اپنے نقطۂ آغاز ہی سے ایک آفاقی دین تھا۔ اسی لئے قرآن نے خدا کو ''تمام دنیا کے مالک'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

رحمٰن اور رحیم کا مفہوم:

''رحمٰن و رحیم'' ایک ہی مادہ رحمت سے مشتق ہیں۔ اسلام کا مقصد چونکہ انسان کو

"خدا محوری" کی جانب لے جاتا ہے اسی وجہ سے بنیادی طور پر ان دو صفتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً اسی سے محبت کرتا ہے جو خود لطف وکرم اور محبت کرنے والا ہو۔ یہ دوصفات خود بہ خود انسان کی توجہ اسکے حقیقی خالق کی طرف موڑ دیتی ہیں اور اس سے محبت کا باعث بنتی ہیں

"الرحمٰن" اور "الرحیم" دونوں کے معنی بہت مہربان اور بہت رحم کرنے والے کے ہیں۔ چونکہ انسانی زبان اللہ کے رحم وکرم کو بیان کرنے سے قاصر ہے اس لئے پے درپے "لفظوں کا استعمال کیا گیا اس کے علاوہ "رحمٰن اور رحیم" کے الفاظ میں لطیف فرق بھی ہے جس کا علماء نے تذکرہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل فرق کا تذکرہ مفسرین نے کیا ہے۔

(۱) "رحمٰن" عربی صرف کے لحاظ سے "فعلان" کے وزن پر ہے جو صفت رحم کے نقطہ کمال کے لئے استعمال ہوتی ہے جبکہ "رحیم" بر وزن "فعیل" ہے جو اس صفت کے مستقل اور مسلسل ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ یعنی 'رحمٰن' کامل ترین لطف ومحبت کو بیان کرتا ہے اور "رحیم" لطف مسلسل کو۔

(۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ رحمان اس مادی دنیا میں اللہ کے عام لطف وکرم کے لئے اور رحیم آخرت میں اس کے مومنین پر مخصوص رحمت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ

(۳) "رحمٰن" اللہ کی اس عمومی محبت اور لطف کو بیان کرتا ہے بلا کسی قید کے انسانوں کے شامل حال ہے۔ خواہ وہ مومن ہو یا کافر، اچھا ہو یا برا، جبکہ رحیم اس کی اس صفت رحم کا نام ہے جو اسکے مطیع اور نیک اعمال کرنے والے بندوں کے لئے مخصوص ہے۔ اس آیت سے ایک اور اہم نکتہ کا استنباط ہوتا ہے۔

کائنات اور اس کے خالق میں کس قسم کا رشتہ ہے؟ قرآن اشارہ فرماتا ہے یہ رشتہ لطف ومحبت ہے جس کے تحت اللہ نے کائنات کو خلق کیا اور کائنات قائم ہے۔ یہ لطف الٰہی ہی

ہے جو دنیا میں انسانی وجود کی بنیاد ہے۔ بعثت انبیاء کا محرک بھی لطف الٰہی ہے۔ یہ سوال ذہن میں آتے ہیں کہ کائنات کو کیوں پیدا کیا گیا ؟ کیوں اسے تکامل کی جانب ہدایت کی گئی ؟ پیغمبروں کو کیوں مبعوث کیا گیا ؟ امامت کا سلسلہ کیوں قائم ہے۔ ان تمام سوالوں کا ایک ہی جواب ہے یعنی اللہ کا لطف عدم کی گہرائیوں سے مخلوق کے وجود کو باہر لانے کا اصل محرک یہی لطف الٰہی ہے جو درحقیقت تمام موجودات کی وجہ خلقت ہے۔ اسی لئے سورہ حمد میں چار بار ان صفات کو دہرایا گیا ہے۔

''رحیم'' اللہ کی اس محبت اور مہربانی کی طرف اشارہ ہے جو اس کے مخصوص، اور پاک بندوں سے مخصوص ہے۔ ''رحمٰن'' صفت ''ربوبیت'' سے متصل ہے اور ''رحیم'' ''مالک یوم الدین'' سے۔ اللہ کا عمومی رحم پوری کائنات کے لئے ہے مگر چونکہ اس نے انسانوں کو قوت اختیار اور قوت فیصلہ عطا کی ہے تاکہ وہ صحیح یا غلط، ہدایت یا گمراہی میں سے کسی ایک راہ کو چن لیں اس لئے جو لوگ راہ ہدیات کا اتباع کریں گے ان کے لئے مخصوص اجر ہے جو اس ''رحیم'' کی صفت سے ظاہر ہے۔

روز جزا وعدل الٰہی اور تصور معاد:

اس آیت میں عدل الٰہی کے اصول کی جانب اشارہ ہے۔ قرآن کریم کے مطابق لطف ورحم خداوند عالم کی اولین صفات ہیں مگر چونکہ اسلام ایک حقیقت پسند دین ہے جس میں نہ تو عیسائیت کی طرح جذبہ لطف ومحبت کو مرکزیت حاصل ہے اور نہ ہی یہودیت کی طرح صفت عدل ہی پر سارا دار ومدار ہے۔ اس لئے اسلام خداوند قدوس کی ان دونوں صفات کا تذکرہ کرتا ہے۔ پہلے رحم پھر اس کے بعد عدل۔ دیکھا جائے تو یہ دونوں صفات درحقیقت وجود کائنات کے اہم اسباب وعوامل ہیں۔ قرآن کے مطابق خالق کائنات نہ صرف لطیف ورحیم ہے بلکہ عادل بھی ہے۔ لہٰذا انسان کو نہ صرف اس سے محبت کرنی چاہئے بلکہ اس کے جلال اور عدل کی وجہ سے اس سے ڈرنا بھی چاہئے۔ یہاں پر غور طلب بات یہ ہے کہ ''رحمٰن ورحیم'' کے

لفظ کو دوبارہ دہرایا گیا، پھر صفت عدل کا ایک بار ذکر ہوا جس سے آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کائنات اور انسان کے معاملات میں اللہ کی دونوں صفات یعنی رحم اور عدل کا کیا تناسب ہے۔

اس دعا کی خاصیت یہ ہے کہ یہ دل کو چھولینے والے انداز میں انسان کو اس کے رب کی جانب متوجہ کرتی ہے۔ انسان کی فطرت میں دو ہی جذبے ایسے ہیں جو اسے سر تسلیم جھکا دینے پر مجبور کردیتے ہیں محبت یا خوف۔ کچھ لوگ محبت میں اپنا سر جھکا دیتے ہیں تو کچھ خوف کی بنا پر۔ اس دعا میں اولاً ان صفات الٰہی کا ذکر ہے جن کا تعلق لطف ومحبت سے ہے اور بعد میں وہ صفات ہیں جو جذبۂ خوف کو بیدار کرتی ہیں اور دونوں صفات کا یکے بعد دیگرے تذکرہ کرنے کے بعد خالق کے عفو وکرم کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ اس کی قدرت مطلقہ کے دائرہ اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے معاف کرے یا جس پر چاہے لطف وکرم کی بارش کرے وہ ایسا قاضی نہیں ہے جس کا کام صرف مجرمین کے لئے سزا تجویز کرنا ہو۔

عدل الٰہی:

اس آیت میں عدل الٰہی کی طرف اشارہ اس اصول کی اہمیت کا غماز ہے۔ اللہ کی جملہ صفات میں عدل کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ متکلمین نے اسے توحید کے بعد دوسرا بنیادی عقیدہ تسلیم کیا ہے۔ عدل الٰہی سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم کے نظام کائنات، قانون سازی اور جزا وسزا میں اصول عدل کارفرما ہے۔ خداوند ہر قسم کے ظلم وزیادتی سے پاک ومبرا ہے۔ کیونکہ کسی بھی قسم کا ظلم ہر ذی شعور کے نزدیک نقص ہے۔ اور اللہ ہر نقص سے پاک وآزاد ہے لہذا اس کا عادل مطلق ہونا واجب ولازم ہے۔

انسان صاحب اختیار اور اپنے اعمال کے لئے ذمہ دار مخلوق ہے۔ اللہ اسے اس کے اعمال کی جزا دے گا جو از لحاظ اصول عدل مناسب ہوگی۔ شیعہ متکلمین نے نظریہ عدل پر اتنا زور اس لئے دیا کیونکہ مسلمانوں کے اندر ہی ایک فرقہ ''اشاعرہ'' کے نام سے وجود میں

آ گیا تھا جس کا نظریہ یہ تھا کہ اللہ اصول عدل پر عمل کرنے کے لئے مجبور نہیں ہے۔ اسے یہ اختیار ہے کہ کسی بدترین مخلوق کو جنت عطا کرے اور ایک بندۂ صالح کو جہنم میں بھیج دے۔ شیعوں کا عقیدہ اس سے بالکل مختلف ہے کیونکہ ذات باری تعالیٰ ہر پہلو اور جہت سے نہ صرف ذات اکمل بلکہ منبع کمال ہے اور ہر طرح کا ظلم نظریہ کمال کے منافی ہے لہذا وہ عادل مطلق ہے۔ علاوہ از ایں شیعوں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ''خیر وشر حقیقی ہیں اور انسان اپنے تمام اعمال وافعال کی انجام دہی کے لئے صاحب اختیار ہے۔ اگر انسان اپنے اعمال وافکار میں صاحب اختیار نہ ہوتو جنت وجہنم کا وجود بے معنی ہوجاتا ہے اور اگر اللہ برائیوں پر جزا اور نیکیوں پر سزا دے تو اخلاقیات پر عمل کرنے کا کوئی محرک باقی نہیں رہتا ہے۔

نظریہ عدل کا ایک رخ اجتماعی اور سیاسی انصاف بھی ہے۔ اسی لئے شیعیت میں اصول عدل کو اپنی ذاتی اور معاشرتی زندگی میں جاری کرنے کی تاکید نظر آتی ہے۔ یہ اصول قرآن کریم کی واضح آیات اور مستند احادیث معصومین سے ماخوذ ہے۔

دین کے معنی:

لفظ دین جزا اور 'مذہب' دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ روز قیامت کو روز جزا بھی کہتے ہیں کیونکہ اس دن صالحین اور مجرمین دونوں کو ان کے اعمال کی پوری جزا ملے گی۔ اسی کو یوم دین بھی کہتے ہیں کیونکہ اس دن انسان کی آنکھوں کے سامنے سے تمام مادی حجابات اٹھ جائیں گے اور وہ اپنے آپ کو تمام حقائق کے روبرو پائے گا۔ دین خود حقیقتوں کے انعکاس کا نام ہے۔

یہ آیت اسلامی جہاں شناسی کے دوسرے اہم عقیدے کی جانب اشارہ کرتی ہے یعنی آخرت پر ایمان۔ جہاں بینی اسلامی کے مطابق کائنات اور انسان صرف مادی وجود میں محدود نہیں ہیں۔ انسانی زندگی ظاہری موت کے بعد بھی جاری رہنے والی ہے۔ اور ہر فرد بشر روز قیامت اپنے اپنے اعمال کا ذمہ دار اور خدا کے نزدیک ان کا جواب دہ ہوگا۔ لفظ دین اس

قانون معاد اور احتساب کی جانب اشارہ کرتا ہے جو کائنات میں جاری وساری ہے۔

اسلام میں عبادت کا مفہوم:

اس آیت میں خطاب غیب سے حضورؐ کی جانب مڑتا ہے۔یعنی ابھی تک جو طرز کلام تھا اس میں مخاطب حاضر نہیں تھا جبکہ اب سیدھے خدا وند عالم کو مخاطب کر کے جملے ادا ہورہے ہیں۔چونکہ ہم اپنے وجود کے ہر پہلو میں ذات واجب کے محتاج ہیں اس لئے ہمیں وہ راستہ بتایا جارہا ہے جس کے ذریعے حقیقی سعادت اور عظمت حاصل ہوسکتی ہے۔یہ راستہ عبادت اور اللہ سے استعانت یعنی طلب امداد کا راستہ ہے۔عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کمال خضوع کے ساتھ اپنے پورے وجود کو سراپا اطاعت بنادے۔

لفظ عبادت کے تین معنی مراد لئے جاتے ہیں۔

(۱) بندگی اور تعظیم

(۲) اطاعت اور خودسپردگی

(۳) خدمت اور انکساری

اسلام میں مفہوم عبادت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔عبادت صرف چند احکام ورسوم وارکان کے بجالانے میں محدود نہیں ہے۔اسلام کے مطابق کسی فرد یا گروہ کا ہر وہ چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا عمل جو خوشنودیٔ خدا یا مرضیٔ خدا کے مطابق انجام دیا جائے عبادت میں داخل ہے۔درحقیقت مرضی خدا پہ چلنے والے مومنین کی حیات کا ہر لمحہ مفہوم عبادت کی عملی تفسیر ہے۔

توحید عبادت:

قرآن یہ نہیں کہتا کہ ’’ہم تیری عبادت کرتے ہیں‘‘ بلکہ کہا جارہا ہے’ ہم صرف اورصرف تیری عبادت کرتے ہیں۔‘‘ یہ جملہ خود توحیدی مفہوم عبادت کو واضح کر دینے کے لئے کافی ہے۔انسان اللہ کی توحید کا اقرار کرتے ہی دوسرے تمام جھوٹے اور خودساختہ خداؤں

اور ان کی بندگی سے ہمیشہ کے لئے آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اب اس اقرار کے بعد اسے کسی دوسرے کے در پر اپنی پیشانی رکھنے یا اس کے غضب سے خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

توحید مطلق کا یہی تصور اسلام کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ کیتھولک چرچ میں تین قسم کی عبادتیں ہیں (۱) خدا کے لئے (۲) حضرت مریم کے لئے (۳) خاصان خدا کے لئے۔ اسی طرح ہندو مذہب میں اندرا، اگنی، سوما، اور نہ جانے کتنے دیوی، دیوتا ہیں جن کے لئے مخصوص عبادتیں انجام دی جاتی ہیں۔ لیکن دین اسلام میں عبادت صرف اور صرف ذات رب العزت ہی کے لئے مخصوص ہے جس میں کوئی نبی بھی شریک نہیں ہے۔

توحید افعال:

نہ صرف یہ کہ ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں بلکہ ہر قسم کی مدد اور استعانت کے لئے بھی صرف اللہ کی جانب ہی رجوع کرتے ہیں۔

چونکہ اسلام عقیدے اور عمل کے مجموعے کا نام ہے لہذا چند نظری جملوں کے بعد قرآن پھر عمل کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ صرف کسی شئی کو مان لینا فلسفہ ہے مگر اس عقیدے کے مطابق عمل کرنا مذہب ہے۔ دین اور فلسفے میں یہی فرق ہے اور یہی فرق ایک پیغمبر اور فلسفی میں ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہمیں صرف اللہ کی عبادت کرنی چاہئے بلکہ اسی سے مدد بھی طلب کرنی چاہئے یہی اسلام کا توحیدی طرز فکر ہے جو انسانی حیات کو عبادات اور اعمال کے خانوں میں نہیں بانٹتا بلکہ انہیں ایک کر کے دیکھتا ہے۔ اسلامی طرز فکر کے مطابق خدا محوری ہمارے تمام اعمال وافعال کا بنیادی اصول ہونا چاہئے چاہے وہ اعمال دنیاوی ہوں یا اخروی۔ مزید برآں ذات باری تعالیٰ ہی ہماری تمامتر عقیدتوں اور امیدوں کا مطمع نظر ہونا چاہئے۔

یہ آیہ کریمہ در اصل عقیدۂ توحید کے عملی پہلو کی رہنمائی کر رہی ہے۔ ایک مسلمان کی پوری حیات قربت الٰہی کے حصول کی سعی پیہم میں بسر ہونی چاہئے۔ اس کی محبت عقیدت،

اعمال یہاں تک کہ اس کی موت وحیات بھی صرف اسی معبود حقیقی کے لئے مخصوص ہونی چاہئے۔ یہی اسلام میں توحید عملی کا تصور ہے۔

ہدایت کا مفہوم اور اس کے مختلف پہلو:

انسان کا مقصد زندگی کیا ہے؟ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے لازوال کامیابی اور فلاح حاصل کرلینا۔صراط مستقیم سے مراد ایسا راستہ ہے جو ہموار اور سیدھا ہو جس میں ناہمواری اور مشکلات نہ ہوں اور جس پر بہ آسانی چلا جا سکے۔ اسی کو ہم سچا راستہ کہتے ہیں۔صراط مستقیم کو حاصل کرنا ہر مسلمان کا مقصد حیات ہے۔ اسی لئے اسلامی اصطلاحات میں یہ اصطلاح زبان زد خلائق ہے۔ مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ صراط مستقیم کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔؟ یہ اسی صورت میں حاصل ہوسکتا ہے جب انسان اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں اللہ سے ہدایت طلب کرتا رہے۔ اللہ نے بنی نوع انسان کے سر پر عقل کا تاج کرامت رکھا ہے مگر فلاح اور کامیابی کے لئے اکیلے انسانی شعور اور عقل ناکافی ہے جب تک ہدایت اور توفیق الٰہی بھی شامل نہ ہو جائے۔ اسلامی نظریہ معرفت اور عقل پرستی میں یہی فرق ہے۔ وہاں ہر شئی کو پرکھنے کا معیار عقل ہے جبکہ یہاں انسانی سعادت وکامیابی اور فلاح کے لئے وحی الٰہی اور نبوت بھی ضروری ہے۔ یہ معبود کا اپنے بندوں پر لطف ہے کہ اس نے ان کی ہدایت کے لئے ایک آئین یعنی قرآن کو وحی کے ذریعے نازل کیا۔

ہدایت سے مراد صرف راستہ دکھا دینا نہیں ہے بلکہ اس وقت تک رہنمائی کرنا ہے جب تک انسان اپنی منزل مقصود تک نہ پہنچ جائے۔ انسان معبود کی استعانت کے بھروسے سیدھے اور سچے راستے پر چلنے اور فلاح کے ساحل سے ہمکنار ہونے کی دعا کررہا ہے۔ لفظ ہدایت مختلف سطح پر مختلف معنی ہے کا حامل ہے (۱) سچا راستہ دکھانا (۲) سچے راستے کی جانب رہنمائی کرنا (۳) سچے راستے پر قائم رکھنا۔ اسی سے یہ بات بھی صاف ہوجاتی ہے کہ اولیاء اللہ یا آئمہ طاہرین ''اھدنا الصراط المستقیم'' کیوں کہتے تھے؟ اس جملے سے ان کی مراد یہ ہوتی

تھی کہ "پالنے والے ہمیں صراط مستقیم پر قائم رکھ۔ یہ آیت قرآن کریم کے نزول کے بنیادی مقصد اور جوہر کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے کہ قرآن کا نزول صرف اس کی عزت وتکریم کرنے کے لئے ہرگز نہیں ہوا ہے بلکہ اس کتاب کا مقصد نزول یہ ہے کہ کاروان انسانیت کو اس کی منزل آخر کا پتہ بتاتے ہوئے اس منزل کی طرف جانے والے سیدھے راستے کی نشاندہی کرے۔ اس کے نازل ہونے کا اولین مقصد بنی نوع انسان کی ہدایت کرنا ہے تا کہ وہ ضلالت اور گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر لطف الٰہی کے نور کو اپنے قلب میں محسوس کر سکے۔

نبوت وامامت اور اسلامی فلسفۂ تاریخ:

اسلام کے بنیادی اصولوں یعنی توحید، معاد، عدل الٰہی، تصور انسان اور جہاں بینی کے تذکرے کے بعد سورہ حمد اب اسلامی فلسفۂ تاریخ اور عقیدہ نبوت وامامت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اسلامی تصور انسان یہ ہے کہ اسے قدرت نے اختیار اور قوت فیصلہ جیسی صفات سے متصف کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اسے ذمہ دار اور اپنے اعمال کے لئے جواب دہ بھی قرار دیا ہے۔ جو لوگ اپنے اختیار سے راہ ہدایت کا انتخاب کرتے ہیں وہ ہدایت یافتہ ہیں۔ وہ لوگ جو گمراہی اختیار کرتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ جو اس لئے گمراہ ہوئے کہ سیدھے راستے تک پہنچ نہ سکے، دوسرے وہ جو جان بوجھ کر انکار کرنے کے باعث اللہ کے غضب کے مستحق بنے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو حق کی شناخت کے باوجود اس کا انکار کرتے اور گمراہی کے فروغ کے لئے عملاً کام کرتے ہیں۔ ہدایت یافتہ اور گمراہ گروہ کے درمیان مسلسل جنگ کا نام تاریخ ہے۔ تاریخ کے وسیع طول وعرض میں اہل حق اور اہل باطل مسلسل ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے ہیں۔ یہ سلسلہ ہابیل وقابیل سے لیکر آج تک اسی انداز میں جاری ہے۔ "جو لوگ ہدایت نہیں پا سکے" وہ ایسے عوام ہیں جن کا تیسرے اہل باطل گروہ نے استحصال کیا حق وباطل کی طاقتوں کے بیچ یہ معرکہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک حق کو آخری فتح اور

باطل کو شکست مطلق نصیب نہ ہو جائے۔ اس جنگ میں ہر فرد بشر کو ان دونوں میں سے ایک گروہ کو اختیار کرنا پڑیگا۔ انسان کو ہر وقت یہ دعا کرنا چاہئے کہ اللہ اپنے بے پایاں لطف وکرم سے اسے اس گروہ میں شامل کرے جو اسکے نیک اور ہدایت یافتہ بندوں کا گروہ ہے نہ کہ ان میں جن پر اس کا غضب نازل ہوا ہے۔

اللہ نے انسان کو قوت اختیار دینے کے باوجود ہدایت کی تلاش میں بھٹکنے کے لئے نہیں چھوڑا بلکہ اپنے لطف ورحم کے تقاضے کے مطابق انسانوں کی ہدایت کے لئے انبیاء کا سلسلہ شروع کیا۔ تاریخ انسانی کے اس طویل سفر میں ہر منزل پر انبیاء، اوصیاء اور اولیاء اللہ انسان کو اس کی حقیقی رہگزر کا پتہ بتانے کے لئے ظاہر ہوتے رہے۔ انسان کا فرض ہے کہ ان سے محبت اور ان کی اتباع کی سعی پیہم کرتا رہے۔

سچا راستہ آخر کیا ہے؟ یہی وہ سوال ہے جو روز اول سے پوچھا جارہا ہے۔ یہ نہ فرعون اور قارون جیسے دنیا پرستوں کا راستہ ہے اور نہ ہی کوئی خواب وخیال کی دنیا۔ یہ صاحبان دولت قوت کا راستہ نہیں بلکہ صالحین اور متقین کا راستہ ہے۔آج کے مادی نظریہ اور اسلامی طرز فکر میں یہی فرق ہے۔ یہ دنیا کے روحانی قائدین کے نقش قدم ہیں جن پر ایک مسلمان چلنا چاہتا ہے اور اس کا ہدف زندگی صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا نہیں۔ بلکہ دوسروں کے روحانی ارتقاء کے لئے بھی سخت جدوجہد کرتا ہے۔ اسی لئے وہ دعا کرتا ہے کہ خداوند عالم حق کو ثابت اور باطل کو نابود کرنے میں متقین کی مدد واعانت فرمائے۔

رسول اکرمؐ اور آئمہ طاہرین کی متعدد احادیث میں آیا ہے کہ'' انبیاء کرام اور آئمہ اہل بیت کا راستہ ہی صراط مستقیم ہے۔'' آنحضرتؐ نے فرمایا ''صراط مستقیم انبیاء کا راستہ ہے اور یہ وہی حضرات ہیں جن پر اللہ نے اپنی رحمتیں نازل کی ہیں۔'' ایک دوسری حدیث میں امام جعفر صادقؑ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔'' خدا کی قسم ہم اہل بیت ہی صراط مستقیم ہیں۔'' یعنی اہلبیت کی ہدایات کے مطابق چل کر ہی صراط مستقیم اور نجات تک رسائی ممکن ہے۔

حدیث ثقلین سے جو حضور اکرمؐ کی مشہور و معروف احادیث میں شامل ہے، اس مضمون پر مزید روشنی پڑتی ہے جس میں کہا گیا ہے: (اے لوگو) میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں اگر تم ان دونوں سے منسلک رہو گے تو ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ انہیں سے ایک اللہ کی کتاب (یعنی قرآن) ہے اور دوسرے میری عترت، میرے اہل بیت" ابن مغازلی نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا "میرے اہلبیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے۔ جو اس میں داخل ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے منحرف ہوا وہ غرق ہو گیا۔"

اس دعائیہ سورے کے آخر میں امید اور خوف دونوں عناصر سامنے آتے ہیں رحمتوں کا بھی تذکرہ ہے اور غضب کا بھی فرمایا جا رہا ہے "ہمیں سچے راستے کی ہدایت فرما، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنی رحمتیں نازل کی ہیں نہ کہ ان کا جن پر تو نے اپنا غضب نازل کیا اور جو گمراہ ہیں۔"

وہ کون لوگ ہیں جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ کون ہیں جو گمراہ ہیں؟ بعض احادیث میں آیا ہے کہ یہ لوگ یہودی اور عیسائی ہیں۔ قرآن بھی عیسائیوں کو "گمراہ ہو گئے۔" (۵:۷۷) سے تعبیر کرتا ہے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: "جن لوگوں پر اللہ کا غضب نازل ہوا وہ یہودی ہیں اور جو لوگ گمراہ ہو گئے وہ عیسائی ہیں (ترمذی ۲:۴۴) لیکن چونکہ قرآن ایک کتاب ہدایت ہے جو تمام زمانوں کے لئے ہے لہٰذا نامناسب ہے کہ اسکی کسی آیت کو کسی خاص واقعہ یا قوم ہی سے منسوب کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں یہ دو گروہ موجود رہے ہیں۔ پہلا گروہ جو رہبران باطل ہیں جو حق کے شدید ترین مخالف ہیں جبکہ دوسرا گروہ عوام کا ہے جو اسی پہلے گروہ کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا ہے اور اس گروہ میں شامل گمراہ لوگ "ضالین" کے مصداق ہیں۔

عقیدہ امامت کی طرف اشارہ:

امامت وہ عقیدہ ہے جس کے مطابق چند ہستیاں ایسی ہیں جنہیں اللہ نے پیغمبر اسلامؐ کا جانشین قرار دیا ہے ان کا فریضہ دین اور شریعت اسلام کی پاسبانی اور صحیح تفسیر وتوضیح اور روحانی مذہبی، معاشرتی ، اور سیاسی معاملات میں امت کی قیادت ہے۔لغت کے اعتبار سے امام کے معنی قائد کے ہیں۔شیعہ اصطلاح کے مطابق امام منصوص من اللہ اور پیغمبرؐ کے ذریعے تعارف شدہ وہ شخصیتیں ہیں جن کا فریضہ امت اسلامیہ کی قیادت ہے ہر مسلمان پر امام کی اطاعت اور محبت واجب ہے۔

مقصد امامت:

پیغمبر اسلامؐ کے دنیا میں تشریف لانے اور قرآن کے واضح اعلان کے بعد کہ آپؐ عی اللہ کے آخری پیغمبرؐ ہیں۔نبوت اپنے نقطہ اختتام تک پہنچ گئی یعنی اب آنحضرت کے بعد قیامت تک کوئی دوسرا نبیؐ نہیں آئے گا۔مگر قرآن واحادیث کی صحیح توجیہ وتفسیر اور بدلتے وقت کے تقاضوں کے لحاظ سے امت کی قیادت کا کام یقیناً باقی رہے گا۔چونکہ سنت الٰہی یہ ہے کہ مشیت کبھی مخلوق کی کسی ضرورت کو تشنہ نہیں چھوڑتی اور ہر مخلوق کو اس کے کمال تک پہچانے کے وسائل فراہم کرتی ہے لہٰذا اس کی رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ نبوت کے بعد بھی انسانیت کی ہدایت کے لئے انتظام موجود ہو۔جس طرح اللہ نے اپنی وحی اور پیغام رسانی کے لئے مخصوص بندوں کا انتخاب کیا اور انہیں عصمت ومعجزہ جیسی قوتیں عطا فرمائیں اسی طرح اس پیغام اور شریعت کی حفاظت کرنے والے اور قرآن وسنت رسولؐ کی صحیح تفسیر کرنے والے آئمہ کرام کو بھی اس نے خود منتخب کیا اور اس امر کو امت کے انتخاب پر نہیں چھوڑا اور انہیں بھی عصمت وکرامات سے آراستہ کیا۔ اگر وحی الٰہی کی توضیح میں خطا اور نسیان کے امکانات باقی رہیں گے تو پوری امت کے ایک ساتھ گمراہ ہوجانے کا خطرہ بھی برقرار رہے گا۔قدرت نے

اسی مقصد ہدایت کو جاری رکھنے کے لئے آئمہ کا انتخاب کیا۔ امام کا منصوص من اللہ ہونا اس لئے ضروری ہے کیونکہ اگر لوگ خود اپنا روحانی پیشوا اور ہادی چنیں گے تو اس انتخاب میں خطا ہونے کے پورے امکانات ہوں گے۔ چونکہ انسان خود معصوم اور خطاؤں سے پاک نہیں ہے لہٰذا اس کا انتخاب بھی ان نقائص سے پاک نہیں ہوسکتا۔ اس غلط انتخاب کا نتیجہ دین کی ناقص تشریح کی صورت میں سامنے آئیگا۔ ساتھ ہی ساتھ امام کو معصوم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اگر اس میں خطا اور نسیان کے امکانات ہوں گے تو پھر امت کی گمراہی کا خطرہ پیدا ہوگا جو عدل الٰہی اور فیضان الٰہی کے فلسفے کے خلاف ہے۔ اسی طرح امام کو منجانب اللہ عالم بھی ہونا چاہئے تا کہ وہ پیغام الٰہی کی مشیت کے مطابق تفسیر کر سکے۔ مختصراً اسے اپنے زمانے کی کامل ترین شخصیت ہونا چاہئے کیونکہ یہ خدا کی حکمت اور عدالت کے خلاف ہے کہ وہ کسی ناقص انسان کو قیادت اور رہبری کے لئے منتخب کرے۔

کیونکہ لطف وفیض الٰہی قابل انقطاع نہیں اور ہدایت الٰہی کی ضرورت ہمیشہ باقی رہنے والی ہے، اس لئے ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ کوئی وقت ایسا ممکن ہی نہیں ہے جب ایک امام موجود نہ ہو (حالانکہ آج وہ پردۂ غیب میں ہیں) امام معصوم، اللہ کی جانب سے علم رکھنے والا اور پیغمبر حضرت محمدؐ کے بعد انسانیت کا کامل ترین فرد ہوتا ہے۔

عقیدہ تولیٰ وتبرّا:

سورہ حمد کی آخری آیت سے نظریہ تولی وتبرا پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ تولی یعنی ہمیں ان لوگوں سے محبت اور ان کی پیروی کرنا چاہئے جن پر اللہ نے خصوصی انعام نازل فرمایا ہے یعنی انبیاء خصوصاً ہمارے نبی حضرت محمد مصطفیٰؐ اور آئمہ اہلبیتؑ۔ تبرا یعنی ہمیں ایسے لوگوں سے اظہار برأت اور نفرت کرنا چاہئے جو اللہ کے دین، اس کے پیغمبروں خصوصاً حضرت محمد مصطفیٰؐ اور اہلبیت کے دشمن ہیں۔ یہی بات اس آیت میں کہی گئی ہے۔

قرآن کریم اور احادیث پیغمبرؐ کے مطابق ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ محمدؐ اور آل محمدؐ

سے دوستی اور محبت رکھے۔ قرآن میں ارشاد ہوا: (اے نبی لوگوں سے) کہئے کہ ہمیں تم سے کوئی اجرت نہیں چاہئے جز میرے قرابتداروں سے محبت کے (۴۲:۲۳)

پیغمبرؐ نے ارشاد فرمایا: وہ اہلبیت سے محبت ایمان کی اور ان سے عداوت کفر کی علامت ہے جو کوئی ان سے محبت کرتا ہے گویا وہ خدا اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہے اور جو کوئی ان سے دشمنی رکھتا ہے گویا وہ خدا اور اسکے رسولؐ سے دشمنی رکھتا ہے۔''

اہلبیت اطہار سے محبت ایک دینی فریضہ ہے جس پر مسلمانوں کے تمام فرقوں کا اتفاق ہے سوائے چند لوگوں کے جنہیں دشمنان اہل بیت رسول گنا جاتا ہے اور جنہیں ''نواصب'' (یعنی وہ جو اہلبیت کے لئے اپنے دلوں میں دشمنی رکھتے ہیں) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام کے ایک بنیادی عقیدے سے انکار کیا ہے۔

یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ صرف اہلبیت کے لئے دل میں محبت رکھنا ہی کافی نہیں ہے جب تک کہ اس میں اطاعت اور پیروی کا عنصر بھی شامل نہ ہو جائے۔ انہیں کے بارے میں پیغمبرؐ کا ارشاد ہے:۔

''میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے جو اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو ان سے منحرف ہوا وہ ہلاک ہوگیا۔'' یہاں سوار ہونے کا تذکرہ ہے۔

سفینۂ نوح کی ہی طرح اس کشتی میں بھی جو سوار ہوا وہ اللہ کی امان کے سائے میں پہنچا اور جو پیچھے رہ گیا وہ شک وشبہات کی متلاطم موجوں میں غرق ہوکر ہلاکت کے گھاٹ اترا۔

اسی لئے عقائد واحکام کے تمام مسائل میں ہمیں انہیں ہستیوں کی جانب رجوع کرنا چاہئے کیونکہ انہیں کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ کا ارشاد ہے: ''میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ اللہ کی کتاب قرآن اور میرے اہلبیت اگر تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب ایک مضبوط رسی ہے جو زمین اور آسمان کے درمیان (رابطے کے لئے) لٹکائی گئی ہے۔ یاد رکھو یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں

ہوں گے۔ یہاں تک کہ حوض (کوثر) پر مجھ سے ملاقات کریں۔'' یہ حدیث بلاتفریق مسلک تمام کتب احادیث میں پائی جاتی ہے اور شیعہ سنی تمام محدثین کا اس پر پورا اتفاق ہے۔ اپنی بلاغت کے اعتبار سے بھی یہ حدیث ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ حدیث کے پہلے جملے میں پیغمبرؐ فرمارہے ہیں کہ میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں جبکہ بعد کے جملے میں دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کے بتارہے ہیں کہ در اصل یہ دونوں ایک ہی ہیں جو کبھی جدا نہیں ہوسکتے۔ پیغمبرؐ یہ فرمارہے ہیں کہ نجات کے لئے دونوں سے وابستگی لازم ہے اس لئے کہ یہ دونوں درحقیقت ایک دوسرے سے جدا ہو ہی نہیں سکتے، یہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر انسان ان میں سے کسی ایک کا دامن تھام کر دوسرے کو چھوڑ دے تو وہ کبھی راہ ہدایت حاصل نہ کرسکے گا۔ اس لئے یہ حضرات سفینۂ نوح کے مانند ہیں۔

☆☆☆☆

ڈاکٹر مظفر سلطان حسن ترابی

سائنسی نظریات اور قرآن

خالق رحیم وکریم اور مالک علیم وخبیر کی کتاب عظیم ''قرآن حکیم'' چونکہ رہتی دنیا تک کے لئے تمام بنی نوع کے دینی و دنیوی سودوبہبود اور فلاح ونجات کی بشارت وضمانت لے کر ایک مکمل دستور حیات وآئین زندگی اور نہایت جامع ضابطہ کار ولائحہ عمل کی حیثیت سے مبدء فیاض کی بارگاہ سے نازل ہوا ہے اس لئے انسانی ذات وصفات اور بشری حیات وکائنات کے ایک باقاعدہ انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت واہمیت رکھتا ہے اس اعتبار سے نہ تو اس کا یہ دعویٰ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے کہ لا رطب ولایابس الا فی کتاب مبین[1] یعنی ''کائنات کی کوئی خشک وتر شئی ایسی نہیں مگر یہ کہ وہ اس روشن کتاب قرآن میں موجود ہے'' اور نہ ہی اس کتاب کا یہ اعلان مبالغہ آمیز نظر آتا ہے کہ ولا اصغر من ذالک ولااکبر الافی اکتاب مبین[2] یعنی ''اور دنیا میں ایک ذرہ سے بھی چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی چیز ایسی نہیں ہے مگر یہ کہ وہ کتاب مبین قرآن حکیم میں موجود ہے۔'' کیونکہ جب ہم قرآن کریم کے ہمہ جہت وہمہ گیر موضوعات ومضامین کی جامعیت ومعنویت کا مطالعہ کرکے اس سے استفادہ کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسی جامع کتاب اور اتنا مکمل صحیفہ ہے جو تمام انسانی اور سائنسی علوم وفنون پر محیط ومشتمل ہے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خواہ ارتقاء پذیر انسانی سماج کے جذبہ تلاش

وجستجو اور ذوق تحقیق وتدقیق کے ارتقائی دور کے مختلف عبوری مراحل ہوں یا سماجی وسائنسی طور پر ترقی یافتہ بشری معاشرے کے گونا گوں انکشافات وایجادات کی تکمیلی منازل ہوں، قرآن حکیم نے جگہ جگہ موقع بہ موقع نہ صرف یہ کہ انسانی وسائنسی علوم وفنون کی کہیں واضح اور کہیں خفیف نشاندہی کی ہے بلکہ کہیں تو انسانی ذات وکائنات کے مختلف شعبہ ہائے حیات اور معاملات زندگی سے متعلق متعدد امور وحقائق اور مسائل ووسائل کو بھی مجمل اور مفصل دونوں ہی طرح سے بیان کیا ہے چنانچہ اس مقدس ومتبرک کتاب میں اساطیر وقصص تواریخ وسیر تہذیب وتمدن ، روایت وثقافت ، معیشت ومعاشرت، تجارت وزراعت ، صنعت وحرفت ، سیاحت ومسافرت ، عبادات ومعاملات ، فقہیات وتذہبیات ، دینیات وعرفانیات ، مادیات وروحانیات ، معقولات ومنقولات ، ادبیات ولسانیات ، سماجیات وعمرانیات ، معاشیات واقتصادیات سیاسیات واخلاقیات ، ارضیات وفلکیات ، بحریات ومعدنیات ، موسمیات فضائیات ، نباتات وجمادات نفسیات وجسمانیات طبعیات وذہنیات ، علم الابدان وعلم الادیان ، علم الحیات وعلم الحیوانات ، علم نجوم وعلم الافلاک ، باغبانی وجہازرانی اور سپہ گری واسلحہ سازی وغیرہ کے ساتھ ہی ہر طرح کے حقوق وفرائض جیسے تمام موضوعات کا کہیں تفصیلی اور کہیں اجمالی طور پر احاطہ ضرور کیا گیا ہے۔

جہاں تک سائنسی علوم کی بات ہے تو اس عظیم کتاب میں اشرف المخلوقات انسان کی عقل سلیم کے اعتبار واعتماد کو اجاگر کرنے کے لئے سائنسی نظریات کے مبانی ومبادیات اور مراکز ومنابع کے اشاروں اور اشاریوں کو بیان کرکے کائنات کے اسرار ورموز اور نکات ومضمرات کی نشاندہی کی گئی ہے اور افلایتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالھا۔[۲] یعنی " کیا یہ لوگ قرآن مین غور وفکر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔؟ " کی سخت تاکیدی ترغیب وتشویق کے ذریعے اہل فکر ونظر

احباب علم دانش صاحبان خرد، ارباب شعور وادراک اور اصحاب تدبیر وتدبر کو بحر وبر، دشت ودر، کوہ وصحرا، وادی وبیابان، زمین وآسمان اور فضا وہوا کی سیر وسیاحت کرکے ان کے سینوں میں چھپے ہوئے قدرت کے خزانوں کو تلاش کرکے اپنے تجربات ومشاہدات کے سہارے ان کی مناسب ترتیب وترکیب سے نئی نئی ایجادات اور اپنے جذبہ تحقیق وتجسس کی بدولت نئے نئے انکشافات کے لئے حوصلہ افزا دعوت دی گئی ہے۔ اور ان کے ذوق تلاش اور شوق ارتقاء کو تیز اور مہمیز کرکے مسلسل پیش رفت کی تحریک پیدا کی گئی ہے۔ اور اس بنیاد پر خالق کائنات ومالک موجودات کی قدرت وحکمت اور اقتدار و اختیارات کو واضح کرکے اس کی خلاقیت و رزاقیت، ملکیت و مالکیت اور ربوبیت و معبودیت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

یوں تو قرآن کریم کی جن آیات بابرکات میں سائنسی علوم کے نکات ونظریات اور مبادیات ومضمرات کی نشاندہی کی گئی ہے ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ انہیں مکمل طور پر شرح وبسط کے ساتھ ضبط تحریر میں لانے کے لئے کئی ضخیم مجلدات درکار ہوں گی۔ اس لئے اختصار کے پیش نظر اجمالی طور پر صرف چند ایسے مقامات وواقع کے بیان پر اکتفا کی جارہی ہے جن میں خالق حکیم وقدیر اور مالک علیم وخبیر کی قدرت وکمالات کے آثار و علامات کے طور پر سائنسی علوم کے مبانی ومنابع اشارے اور اشاریئے بہت واضح اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

چنانچہ ارضیات وفلکیات، بحریات وموسمیات اور جمادات ونباتات جیسے سائنسی موضوعات ونظریات کے سلسلے میں تخلیق ارض وسما، گردش لیل ونہار بے کراں سمندروں اور بے پایاں دریاؤں کے سینوں پر رواں دواں کشتیوں اور جہازوں کی سمت ورفتار اور ان سے لوگوں کو پہنچنے والے منافع وفوائد، آسمان سے نازل ہوکر مردہ و افتادہ بیکار

ومردار زمینوں اور پژمردہ کھیتوں کو دوبارہ زندہ اور سرسبز وشاداب کر دینے والی باران رحمت ، سبزہ زاروں اور مرغزاروں میں چلنے پھرنے والے قسم قسم کے چوپایوں ، خوشگوار فرحت بخش ہواؤں کے جھونکوں اور زمین وآسمان کے درمیان آویزاں وجنباں منڈلاتے ہوئے ابر ہائے گہر بار کے فیوض وبرکات کو صاحبان عقل وخرد کے لئے اپنی قدرت کاملہ کی نشانیاں قرار دیتے ہوئے سورۂ مبارکہ بقرہ میں رب کریم کا ارشاد ہے کہ ''بے شک زمین وآسمان کی تخلیق اور رات دن کے ردوبدل میں ، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لئے فائدہ مند اور نفع بخش اسباب واشیاء یعنی تجارتی سازوسامان دریاؤں اور سمندروں میں لے کر چلتی ہیں ، اور اس فیض بخش پانی میں جو خدا نے آسمان سے برسایا اور پھر اس سے زمین کو مردہ وبیکار ہوجانے کے بعد دوبارہ جلا کر سرسبز وشاداب کردیا اور اس میں ہر طرح کے جانور پھیلا دیے، اور ہواؤں کو چلانے میں اور بادل میں جو خدا کے حکم سے زمین وآسمان کے درمیان گھرا ہوا معلق رہتا ہے غرض کہ ان سب باتوں میں عقل والوں کے لئے خدا کی قدرت وحکمت کی بڑی بڑی نشانیاں ہیں ۔''

اسی طرح تخلیق کائنات کے سلسلے میں ارضیات وفلکیات ، بحریات ومعدنیات ، موسمیات وفضائیات نیز مشروبات وغذائیات اور معاشیات واقتصادیات کے ساتھ ہی مادۂ تخلیق اور علم الحیات کے حوالے سے کئی سائنسی نظریات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ۔ اور اس کے ذریعے اہل ذکر وشکر اور صاحبان عقل وفکر کو خدا کی قدرت وکمالات کی طرف متوجہ کرتے ہوئے سورۂ نحل میں ارشاد ہوتا ہے کہ۔

''اسی نے زمین وآسمان کو برحق وباحکمت پیدا کیا تو لوگ جن کو اس کا شریک بناتے ہیں وہ ان سے بہت برتر ہے ۔ اسنے انسان کو نطفے سے پیدا کیا پھر وہ انسان اپنے اسی خالق کا دشمن ہوگیا۔ اسی نے چوپایوں کو پیدا کیا۔ جن کی کھال اور ان میں

تمہارے جزاول اور دوسرے کھانے پہننے کے نفع بخش اور فائدہ مند ساز وسامان بھی ہیں۔ اور جب تم انہیں صبح چرانے کے لئے لے جاتے ہو اور شام کو واپس لاتے ہو تو ان سے تمہاری رونق ہوتی ہے اور جن شہروں میں تم بغیر سخت زحمت ومشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے وہاں تک یہ چوپائے تمہارے بوجھ اٹھا کر لے جاتے ہیں بے شک تمہارا پروردگار بڑا رحم کرنے والا شفیق ومہربان ہے۔ اور اسی نے گھوڑوں، خچروں اور گدھوں کو پیدا کیا تاکہ تم ان پر سواری کرو اور ان میں تمہارے لئے زیب وزینت اور شان وشوکت بھی ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بھی چیزیں پیدا کی ہیں جنہیں تم جانتے بھی نہیں ہو۔ اور سیدھے راستے کی ہدایت تو خدا ہی کے ذمہ ہے اور بعض راستے ٹیڑھے بھی ہوتے ہیں اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو منزل مقصود تک پہنچا دیتا۔ وہ خدا وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا۔ جس میں سے تم پیتے ہو اور جس سے درخت سرسبز وشاداب ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو اور خدا اسی پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اگاتا ہے اور ہر طرح کے پھل پیدا کرتا ہے بے شک اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لئے خدا کی قدرت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ اور اپنے پروردگار کے حکم کے تابع رات اور دن اور چاند اور سورج اور ستاروں کو بھی تمہارے تابع بنا دیا ہے۔ بے شک اسمیں صاحبان عقل وخرد کے لئے قدرت خدا کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور اس نے تمہارے لئے زمین میں جو مختلف رنگوں کی چیزیں پیدا کیں، بے شک ان میں بھی اہل ذکر وفکر کے لئے خدا کی قدرت وحکمت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ وہ خدا وہی ہے جس نے دریا کو تمہارے قبضہ میں کردیا ہے تاکہ تم اس میں سے مچھلیوں کا تازہ گوشت کھاؤ اور اس میں سے زیور کے لئے بھی (موتی وغیرہ) نکالو جن کو تم پہنتے ہو اور تم کشتی کو دیکھتے ہو کہ دریا کے سینے پر اس کے پانی کو چیرتی ہوئی رواں دواں رہتی

ہیں، تا کہ تم ان کے ذریعے تجارت کے لئے سیر وسیاحت کر کے اللہ کے فضل وکرم سے اپنا نفع اور فائدہ تلاش کرو اور اس کی نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرو۔ اور اسی نے زمین کے سینے پر بھاری بھرکم پہاڑوں کو گاڑ دیا تا کہ زمین تمہیں لے کر جھک نہ جائے۔ اور نہریں ندیاں اور راستے بنائے تا کہ تم آرام اور آسانی سے منزل مقصود تک پہنچو۔ اور تمہاری رہنمائی کے لئے اور بھی بہت علامتیں اور نشانیاں اور ستارے بھی پیدا کئے ہیں جن سے لوگ راستہ اور منزل کا پتہ معلوم کرتے ہیں تو کیا وہ خدا جو اتنی ساری چیزوں کو پیدا کرتا ہے وہ ان بتوں کے برابر ہے جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ کیا تم اتنا بھی نہیں سمجھتے ؟[۲]

اسی سورۂ مبارکہ میں باران رحمت کے نزول اور اس سے مردہ وافتادہ زمینوں کی نئی زندگی اور پژمردہ کھیتوں کی شادابی دودھ دینے والے جانوروں کے جسم میں چارہ اور غذا کے کیمیاوی عمل کے بعد دودھ کی شکل میں مقوی اور شیریں وخوشگوار مشروب اور انگور جیسے غذائیت اور دوائیت سے بھرپور خوش مزہ پھلوں کے کیماوی عمل کے نتیجے میں شراب وسرکہ کی پیداوار اور شہد کی مکھی کے ذریعے چوسے گئے پھلوں اور پھولوں کے رس کے کیمیاوی عمل سے شریں وخوشگوار اور نفع بخش وشفا بخش غذائیت ودوائیت سے بھرپور مشروب شہد جیسی مفید ومقوی چیز کے حوالے سے ارضیات وفلکیات نباتات وجمادات کیمیا و ادویات اور معاشیات واقتصادیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور اہل فکر ونظر واور صاحبان عقل وخرد کو خدا کی قدرت وکمال کی نشانیوں کی طرف دعوت فکر ونظر دیتے ہوئے ارشاد کیا گیا ہے کہ۔

" اور خدا ہی نے آسمان سے پانی برسایا پس اس کے ذریعے مردہ وبنجر زمینوں کے بے کار وبے جان ہوجانے کے بعد پھر سے زندہ وجاندار اور سرسبز وشاداب کیا بے شک اس میں سننے اور سمجھنے والی قوم کے لئے خدا کی قوت وحکمت کی بڑی روشن نشانی

ہے۔ اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں بھی عبرت ونصیحت کی باتیں ہیں کہ ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون ہے اسی میں سے ہم تم کو خالص اور خوشگوار دودھ پلاتے ہیں اور کھجور اور انگور جیسے پھلوں سے شیریں وبہترین رزق عطا کرتے ہیں جس سے تم شراب اور سرکہ جیسی بری اور اچھی دونوں طرح کی غذا کی تیار کرتے ہو، بے شک اس میں صاحبان عقل وخرد کے لئے خدا کی قدرت کاملہ کی بڑی نشانی ہے۔ اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو وحی کے ذریعے ہدایت کی کہ تو پہاڑوں درختوں اور ٹٹیوں کے اونچے اونچے مکانوں میں اپنے چھتے بنالے پھر ہر طرح کے پھلوں اور ان کے پھولوں سے رس چوس لے پھر اپنے پروردگار کے راستے پر تابعداری اور فرمانبرداری اور اطاعت گذاری کے ساتھ روانہ ہوجا۔ شہد کی مکھی کے پیٹ سے مختلف رنگوں کا مشروب یعنی شہد نکلتا ہے۔ اس میں لوگوں کے لئے بیماریوں سے شفا ہے۔ بے شک اس میں غور وفکر کرنے والوں کے لئے قدرت خدا کی بہت بڑی نشانی ہے۔'' ے

آگے چل کر اسی سورہ مبارکہ میں انسان کی خلقت ، ان کے اعضا وجوارح اور چرند وپرند اور ان سے حاصل ہونے والے مختلف فیوض وفوائد کے حوالے سے عمرانیات ومعاشیات اور فضائیات اور موسمیات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علم الحیات وعلم الحیوانات کی طرف توجہ دلا کر صاحبان ایمان وافتان کو اللہ کی قدرت وکمال کی طرف دعوت فکر ونظر دی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

'' اور خدا ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے ایسی حالت میں پیدا کیا کہ تم بالکل بے علم اور ناسمجھ تھے۔ اور اس نے تمکو کان دیئے اور آنکھیں عطا کیں اور دل عنایت فرمائے تاکہ تم اس کا شکر بجالاؤ۔ کیا لوگ پرندوں کو غور سے نہیں دیکھتے جو آسمان کے نیچے ہوا میں گھرے ہوئے محو پرواز رہتے ہیں۔ ان کو صرف خدا ہی گرنے سے

بچائے رکھتا ہے۔ بیشک اس میں ایمان والوں کے لئے خدا کی قدرت وحکمت کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خدا ہی نے تمہارے لئے تمہارے گھروں کو تمہاری سکونت گاہ قرار دی ہے۔ اور اسی نے تمہارے لئے چوپایوں کی کھالوں سے خیموں کی شکل میں ایسے ہلکے پھلکے گھر بنائے جنہیں تم سبک پا کر اپنے سفر وحضر میں استعمال کرتے ہو۔ اور اس نے ان کے روئیں اور بالوں سے تمہارے لئے قیامت تک کے لئے وسائل زندگی سے متعلق بہت سی کار آمد چیزیں بنائیں اور سازوسامان مہیا کئے اور خدا ہی نے تمہارے آرام وسکون کے لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں سے سائے بنائے اور تمہارے لئے پہاڑوں کے غاروں کی شکل میں گوشہ گاہ وپناہ گاہ اور اقامت گاہ بنائیں اور تمہارے لئے پوشاک بنائیں جو تمہیں سردی گرمی سے محفوظ رکھتی ہیں اور ایسے آہنیں لباس بنائے جو تمہیں ہتھیاروں کی ضرب سے بچالیں۔ اسی طرح خدا تم پر اپنی نعمتیں تمام کرتا ہے تا کہ تم اس کی اطاعت گزاری وفرمانبرداری کرو''۔۸

سورہ مبارکہ حج میں انسان کی تخلیق کے سلسلے میں رحم مادر میں زیر تخلیق بچے کے تدریجی ارتقاء کو واضح کرتے ہوئے اس کی خلقت کے مختلف تشکیلی مراحل اور تکمیلی منازل کی پوری طرح وضاحت کر کے علم الاجسام وعلم الحیات کی بڑی تفصیل کے ساتھ اس انداز سے ترتیب وار تشریح کی گئی ہے جس کی مکمل تصدیق وتائید آج کی جدید ترین سائنسی تحقیقات اور طبی انکشافات سے بخوبی ہوتی ہے۔ چنانچہ ارشاد کیا گیا ہے کہ

''اے لوگو! اگر تم کو مرنے کے بعد پھر سے زندہ کئے جانے میں کسی طرح کا کوئی شک وشبہ ہے تو ہم نے یقیناً پہلے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر منجمد خون کے تھکے سے پھر اس لوتھڑے سے جو پورا سڈول ہو یا ادھورا بے ڈول، تا کہ ہم تم پر اپنی قدرت وحکمت کو روشن و واضح کر دیں۔ اور ہم عورتوں کے رحموں میں جس نطفے (جنین)

کو چاہتے ہیں ایک معین مدت اور مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں پھر تم کو بچہ بنا کر پیدا کرتے ہیں ۔ پھر تمہیں پالتے پوستے اور پروان چڑھاتے ہیں تا کہ تم اپنے بلوغ اور شباب کو پہنچو ۔ اور تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو بڑھاپے سے پہلے ہی فوت ہو جاتے ہیں ۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو معذور و مجبور زندگی بڑھاپے تک کھینچ لاتے ہیں تا کہ جاننے اور سمجھنے کے بعد پھر سٹھیا کے کچھ بھی نہ سمجھ سکیں ۔ اور تم مردہ و افتادہ بیکار زمین دیکھ رہے ہو ، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ زندہ اور سرسبز و شاداب ہو کر لہلہانے اور ابھرنے بڑھنے لگتی ہے اور ہر طرح کی خوشنما چیزیں اگاتی ہے ۔ ہماری قدرت و حکمت کے یہ کرشمے اس لئے ہیں تا کہ تم جان اور سمجھ لو کہ بے شک خدا برحق ہے اور یقیناً وہی مردوں کو جلاتا ہے اور بے شک ہر چیز پر قادر ہے ۔ اور یقیناً قیامت آنے والی ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے اور بے شک جو لوگ قبروں میں ہیں ان کو خدا دوبارہ زندہ کرے گا''۔ ۹

موجودہ تازہ ترین مسلمہ سائنسی تحقیقات اور طبی انکشافات کے مطابق رحم مادر میں دنوں ہفتوں اور مہینوں کے حساب سے بچے کے تخلیقی ارتقاء کے اعتبار سے اس کی ہیئت و جبلت میں جو مرحلہ وار تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس سلسلے میں سورہ مبارکہ مومنون میں مزید وضاحت کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے کہ

'' اور ہم نے انسان کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ، پھر ہم نے اس کو ایک محفوظ جگہ یعنی رحم مادر میں نطفہ کی شکل میں رکھا ، پھر ہم نے نطفے کو منجمد خون بنایا ۔ ، پھر ہم نے منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنایا ، پھر ہم نے لوتھڑے کی ہڈیاں بنائیں ، پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر ہم نے اس میں روح ڈال کر ایک دوسری شکل و صورت میں انسان بنا کر پیدا کیا ۔ پس خدا کی ذات بابرکات کا کیا کہنا جو تمام بنانے والوں سے بہتر

وبرتر ہے پھر اس کے بعد یقیناً تم سب کو ایک دن مرنا ہے پھر قیامت کے دن دوبارہ زندہ کئے جاؤ گے۔''[۱۰]

اس سلسلے میں سورہ مبارکہ مومن میں بھی رحم مادر میں نطفے سے لے کر بچے کی تکمیل تک انسان کی خلقت کی مختلف کیفیتوں اور حیثیتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے۔

''وہ خدا وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفے سے پھر منجمد خون سے پھر تم کو بچہ کی شکل میں پیدا کیا، پھر پروان چڑھایا تا کہ تم اپنے شباب اور جوانی تک پہنچو، پھر زندہ رکھا تا کہ بڑھاپے کی منزل تک پہنچو اور تم میں سے کوئی ایسا ہے جو اس سے پہلے ہی وفات پا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ تم اپنی زندگی کے آخری مقام اور موت کے مقررہ وقت تک پہنچ جاؤ اور تا کہ تم اس کی قدرت وحکمت کے سلسلے میں عقل وخرد سے کام لو۔''[۱۱]

سورۂ مبارکہ مومنون ہی میں ایک جگہ فلکیات وموسمیات، جمادات ونباتات، زراعت وباغبانی، سیاحت وتجارت اور علم الحیوانات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد کیا گیا ہے کہ۔

''اور یقیناً ہم نے تمہارے اوپر تہ بہ تہ سات آسمان بنائے اور ہم مخلوقات سے بے خبر نہیں ہیں۔ اور ہم نے آسمان سے ایک مقررہ مقدار میں پانی برسایا پھر اس کو زمین میں حسب ضرورت ومصلحت ٹھہرائے رکھا اور یقیناً ہم اس کو غائب کردینے پر بھی قادر ہیں۔ پھر ہم نے تمہارے لئے اس پانی سے کھجوروں اور انگوروں کے باغات پیدا کئے اور تمہارے لئے ان میں بہت سے میوے پیدا کئے اور ان میں سے تم کھاتے ہو۔ اور ہم نے زیتون کا درخت پیدا کیا جو طور سینا (پہاڑ) پر اگتا ہے اس سے تیل نکلتا ہے اور وہ

کھانے والوں کے لئے سالن بھی ہے۔ اور بے شک تمہارے لئے چوپایوں میں بھی عبرت ونصیحت کا سامان موجود ہے۔ ان کے پیٹ میں جو کچھ ہے اس سے ہم دودھ بنا کر تم کو پلاتے ہیں۔ اور ان میں تمہارے لئے اور بھی بہت سے فوائد ومنافع ہیں۔ اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو اور انہیں جانوروں اور کشتیوں پر چڑھے چڑھے گھومتے پھرتے ہو۔ ۱۲

سورۂ مبارکہ واقعہ میں انسان کی خلقت، باران رحمت اور آب وآتش وغیرہ کے حوالے سے اپنے الطاف وعنایات کی یاددہانی کراتے ہوئے علم الحیات وعلم نباتات، فلکیات وموسمیات اور زراعت وغیرہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ۔

"کیا تم نے اس نطفے کو دیکھا ہے جو عورتوں کے رحم میں ڈالتے ہو؟ کیا اس سے تم انسان خلق کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں؟ ہم نے تم لوگوں میں موت کو مقرر ومقدر کردیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہارے جیسے اور لوگ بدل ڈالیں اور تم لوگوں کو اس شکل وصورت میں پیدا کریں جسے تم بالکل نہیں جانتے۔ اور تم نے پہلی پیدائش کو تو سمجھ ہی لیا ہے پھر غور وفکر کیوں نہیں کرتے؟ تم جو کچھ بوتے ہو، کیا تم نے اسے دیکھا ہے؟ کیا اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں؟ اگر ہم چاہتے تو اسے ٹکڑے ٹکڑے اور چور چور کردیتے۔ اور تم باتیں ہی بناتے رہ جاتے کہ ہم تو مفت میں تاوان اور جرمانے میں پھنس گئے بلکہ ہم تو محروم اور بدنصیب ہی ہیں کیا تم نے اس پانی کو بھی دیکھا ہے جسے تم پیتے ہو؟ کیا اسے بادل سے تم نے برسایا ہے یا ہم برساتے ہیں؟ اگر ہم چاہیں تو اسے کھاری بنادیں پس تم شکر کیوں نہیں کرتے؟ کیا تم نے آگ کو دیکھا ہے؟ جسے تم لکڑی سے نکالتے ہو؟ کیا اس کے درخت کو تم نے پیدا کیا ہے یا ہم پیدا کرتے ہیں؟ ہم نے آگ کو جہنم کی یاددہانی اور مسافروں کے متاع ومنافع کے لئے قرار دیا ہے۔ ۱۳

سورۂ مبارکہ یوسف میں فصلوں اور زراعتوں کی پیداوار کو ذخیرہ کر کے کوداموں میں طویل مدت تک محفوظ رکھنے کی تدبیر وترکیب حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی بالیوں اور گچھوں میں ہی پیداوار کو برقرار رکھ کر بتائی گئی ہے اس کا عملی ثبوت اہرام مصر میں ہزاروں سال قبل مدفون افراد کے مقبروں سے صحیح وسالم برآمد ہونے والی بالیوں سمیت اجناس سے مل چکا ہے اور وہ تدبیر عزیز مصر کے ایک خواب کی تعبیر کے سلسلے میں اس طرح بیان کی گئی ہے۔

''یوسف نے کہا (اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ) تم لوگ متواتر سات برس تک جو کاشتکاری کرتے رہو گے تو اس سے جو فصل کاٹو اس کی پیداوار کو بالیوں ہی میں لگی رہنے دینا۔ (چھڑانا نہیں) مگر اتنا تھوڑا بہت (حسب ضرورت) جو تم کھاؤ۔ پھر اس کے بعد بڑے سخت خشک سالی کے سات برس آئیں گے۔ ان میں ہم لوگوں نے جو کچھ ان سالوں کے لئے پہلے جمع کر رکھا ہے سب کھا جائیں گے مگر صرف اتنا تھوڑا بہت جو تم بیج کے لئے بچا رکھو گے پھر اس کے بعد ایک ایسا سال آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب مینھ برسے گا۔ (اور انگور بھی اتنا پھلے گا) کہ اس کو شراب کے لئے نچوڑیں گے۔ [۱۴]

ان آیات بابرکات کے علاوہ بھی ایسی آیتیں بہت کثیر تعداد میں ہیں جن میں زمین وآسمان کوہ وبیابان، دشت ودر، بحر وبر شمس وقمر، آب وآتش، اشجار واثمار، وغیرہ کے حوالے سے حیات وکائنات کی تخلیق کا ذکر کر کے انسانی وسائل علوم وفنون کے مبانی ومبادی اور مراکز ومنابع کی نشاندہی کی گئی ہے۔ خاص طور سے سورہ مبارکہ رحمٰن، سورہ مبارکہ دہر وسورۂ مرسلات اور بیسویں پارے کی متعدد سورتوں مثلاً سورہ نبا، سورہ نازعات، سورہ عبس، سورہ تکویر، سورہ انفطار، سورہ انشقاق سورۂ شمس اور سورہ زلزال میں حیات وکائنات کے نکات ومضمرات اور اسرار ورموز کے پس منظر وپیش منظر میں خدا کی

قدرت وحکمت اور کرامات وکمالات کے بڑے موثر اور محرک اشارے موجود ہیں ۔ اور ایسی تمام آیات بابرکات رہتی دنیا تک ہر ذی علم ودانش، تمام اہل فکر ونظر، صاحبان عقل وخرد، ارباب شعور وادراک، اصحاب ذکر وشکر اور جماعت تدبیر وتدبر نیز شائقین وتحقیق وتدقیق کے ذوق انکشافات وشوق ایجاد کے جوش وجذبہ کو تیز اور مہمیز کرتی رہیں گی۔

حوالے:

۱۔قرآن کریم سورہ انعام آیت ۵۹

۲۔سورہ یونس آیت ۶۱

۳۔سورہ سبا آیت ۳

۴۔سورہ محمد آیت ۲۴

۵۔سورہ بقرہ آیت ۱۶۴

۶۔سورہ نحل آیت ۳ تا ۱۷

۷۔سورہ نحل آیت ۶۵ تا ۶۹

۸۔سورہ نحل آیت ۷۸ تا ۸۱

۹۔سورہ حج آیت ۵ تا ۷

۱۰۔سورہ مومنون آیت ۱۲ تا ۱۶

۱۱۔سورہ مومن آیت ۶۷

۱۲۔سورہ مومنون آیت ۱۷ تا ۲۲

۱۳۔سورۂ واقعہ آیت ۵۸ تا ۷۳

۱۴۔سورہ یوسف آیت ۴۷ تا ۴۹

☆☆☆☆☆☆

حدیث شناسی:

علامہ محمد رضا حکیمی

دوسری فصل: طلب علم

علم قرآن کی جستجو:

(۱) خدا نے تو ایمان والوں پر بڑا احسان کیا کہ ان کے واسطے انھیں کی قوم کا ایک رسولؐ بھیجا جو انھیں خدا کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی طبیعت کو پاکیزہ کرتا ہے اور انھیں کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے۔ اگرچہ وہ پہلے ہوئی گمراہی میں پڑے تھے۔[۱]

طلب علم حدیث میں:

علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر واجب ہے۔[۲] (رسول مقبولؐ)

علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے واضح رہے کہ خدا علم ودانش تلاش کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔[۳] (رسول مقبولؐ)

علم کا متلاشی مجاہد راہ خدا کی طرح ہے۔[۴] (امام علیؑ)

عالم ہوجاؤ یا علم کی تلاش میں رہو۔ ان دونوں کے علاوہ تیسری قسم تمہاری ہلاکت کا باعث ہوگی۔[۵] (امام علیؑ)

ہر حال میں علم حاصل کرنا واجب ہے۔[۶] (امام صادقؑ)

علم حاصل کرو چاہے بھنور میں ہی کیوں نہ جانا پڑے اور خطروں کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔[۷] (امام صادقؑ)

اگر لوگ علم کی اہمیت کو جان لیتے تو اس کی تلاش میں دور دراز کا سفر کرنے اور ہر طرح کے مصائب برداشت کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتے۔ (امام صادقؑ)

پیغمبر اکرمؐ سے: عالم بنو یا علم حاصل کرنے والا بنو اور وقت گزاری اور لذت طلبی سے پرہیز

کرو۔ ۹؎ (امام باقرؑ)
کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جو علم کی جستجو میں لگا ہوا ہو اور خدا کی رحمت اس کے شامل حال نہ ہو۔ ملائکہ اسکے لئے صدا دیتے ہیں کہ مرحبا اے زائر خدا اور اسی طرح وہ جنت کا راستہ بھی طے کر لے گا۔ ۱۰؎ (امام باقرؑ)
لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں عالم یا علم حاصل کرنے والے اور اس کے سوائے جو بھی ہیں وہ لا ابالی اور وحشیوں کی طرح ہیں ان لوگوں کو آگ میں ڈالا جائے گا۔ ۱۱؎ (امام صادقؑ)

علم دین سکھانا نیکی ہے اور اس کی تلاش جہاد۔ اور جو نہیں جانتا (ان پڑھ) اس کو بتانا (پڑھانا) صدقہ ہے۔ خوف کے وقت علم مونس وہمدم اور تنہائی میں راستہ ہے اور خدا علم کی برکت سے لوگوں کو بچاتا ہے اور اچھائی اور نیکی کا رہنما قرار دیتا ہے تاکہ دوسرے لوگ ان کی پیروی کریں۔ علم دلوں کی زندگی ہے اور ضعف میں بدن کی قوت اور علم کی وجہ سے خدا کی عبادت ہوتی ہے۔ ۱۲؎ (امام علیؑ)
ایسے جوان کو میں قطعی پسند نہیں کرتا جو ان دو صورتوں میں سے کسی ایک میں رات بسر نہ کرتا ہو یعنی وہ خود عالم ہو یا پھر متعلم اگر ایسا نہیں کرتا تو اس نے غلطی کی ہے ایسی غلطی کہ اپنے آپ کو تباہ وبرباد کرلیا اور اگر تباہ وبرباد کرلیا تو گناہ گار ہے اور اگر گناہ گار ہے تو دوزخ میں جگہ پائے گا۔ ۱۳؎ (امام صادقؑ)

عقل کی عظمت وفضیلت:

آسمان اور زمین کی پیدائش اور رات دن کے ردوبدل میں اور کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں دریا میں لے کر چلتی ہیں اور پانی جو خدا نے آسمان سے برسایا پھر اسے زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پیدا کئے اور ہواؤں کو ہر طرف سے چلایا اور بادلوں کو آسمان وزمین کے درمیان رکھا یہ سب خداوند عالم کی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو اپنی عقل کو کام میں لیں۔ ۱۴؎

(دوزخی) کہیں گے کہ اگر ہم نے سنا، سمجھا اور اپنی عقل کو کام میں لیا ہوتا تو آج ہم دوزخیوں میں سے نہ ہوتے۔ ۱۵

اس کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ تم کو ڈرانے اور امید دلانے کے واسطے بجلی چمکاتا ہے، آسمان سے پانی برساتا ہے اور اسکے ذریعہ سے زمین کو اس کے بنجر ہونے کے بعد آباد کرتا ہے۔ بے شک عقلمندوں کے واسطے اس میں قدرت خدا کی بہت سی دلیلیں ہیں۔ ۱۶

اس نے تمہارے واسطے رات، دن سورج اور چاند کو تمہارے تابع بنادیا ہے اور ستارے بھی اسی کے حکم سے تمہارے فرمانبردار ہیں۔ کچھ شک ہی نہیں کہ اس میں سمجھ دار لوگوں کے واسطے یقیناً قدرت خدا کی بہت سی نشانیاں ہیں۔ ۱۷

۱۔انسان عقل کے ذریعہ ساری نیکیاں حاصل کرتا ہے جس کے پاس عقل نہیں ہے اس کے پاس دین نہیں ہے۔ ۱۸ (پیغمبرؐ)

۲۔کچھ لوگوں نے آپؐ کے حضور میں ایک شخص کو کھڑا کیا اور اس کی تمام نیک خصلتیں بیان کرنے لگے۔ پیغمبرؐ نے فرمایا (اس کی عقل کیسی ہے؟) کہا اے پیغمبرؐ ہم آپ کو اس کی عبادت میں چستی اور دوسری خوبیوں کے بارے میں بتارہے ہیں اور آپ ہم سے اس کی عقل کے بارے میں پوچھ رہے ہیں؟ پیغمبرؐ نے فرمایا احمق اپنی حماقت کی وجہ سے گناہ گار سے زیادہ گناہوں میں آلودہ ہوجاتا ہے۔ خدا کل قیامت میں اپنے بندوں کے درجات ان کی عقلوں کے کے مطابق عطا کرے گا۔ ۱۹ (رسول مقبولؐ)

۳۔ ہر چیز کے لئے ساز وسامان ضروری ہے اور مومن کا ساز وسامان عقل ہے۔ ہر چیز کے لئے مرکب ضروی ہے اور انسان کا مرکب عقل ہے۔ ہر چیز کا ایک انجام ہے اور عبادت کا انجام عقل ہے۔ ہر تاجر کے لئے مال ضروری ہے اور خدا کی راہ میں کوشش کرنے والوں کا مال ان کی عقل ہے۔ ہر ویرانے کو آبادی کی ضرورت ہے اور آخرت کی آبادی عقل

سے ہے اور ہر مسافر کے سکون و اطمینان کے لئے سائبان ضروری ہے تاکہ اس کی پناہ میں جا سکے اور مسلمانوں کا سائبان ان کی عقل ہے۔ ۲۰ (رسول مقبولؐ)

۴۔ خداوند عالم نے اپنے بندہ کے لئے عقل سے بہتر کوئی چیز نہیں بنائی۔ اسی وجہ سے عاقل کی نیند جاہل کی شب بیداری سے افضل ہے اور عاقل کا روزہ رکھنا جاہل کے روزہ رکھنے سے افضل ہے اور کسی جگہ پر عاقل کا ٹھہرنا جاہل کے چلنے سے بہتر ہے۔ ۲۱

۵۔ عقل علم کی سواری ہے۔ ۲۲ (امام علیؑ)

۶۔ انسان اپنی عقل کی وجہ سے انسان ہے۔ ۲۳ (امام علیؑ)

۷۔ کسی کی خصلتوں میں سے اگر کوئی نیک خصلت مجھ پر ثابت ہو جائے۔ تو اس کا میں احسان مند ہوں گا۔ اگر اس میں کوئی اور کمی ہے تو اس کو میں نظر انداز کردوں گا لیکن عقل و دین نہ ہونے پر نظر انداز نہیں کروں گا۔ کیوں کہ دین سے جدائی امن سے جدائی ہے اور بدامنی و تشویش کی زندگی مجھ کو گوارہ نہیں۔ عقل کا فقدان حیات کے فقدان جیسا ہے اور بے عقل مُردوں جیسا ہے۔ ۲۴ (امام علیؑ)

۸۔ انسان کے اندر عقل اور اس کی شکل وصورت دو اہم چیزیں ہیں۔ اگر کسی کی عقل اس سے منھ موڑ لے اور صرف شکل وصورت باقی رہ جائے تو وہ انسان مکمل نہیں ہے بالکل اسی طرح جیسے جسم میں روح باقی نہ ہو۔ ۲۵ (امام علیؑ)

۹۔ بیٹا حسنؑ! جس کے پاس عقل ہے وہ سب سے بڑا غنی ہے اور سب سے بڑا فقیر احمق ہے۔ ۲۶ (امام علیؑ)

۱۰۔ میرے بیٹے! نادان سے زیادہ کوئی فقیر نہیں ہے اور کوئی بھی فقر عقل کے فقر سے بدتر نہیں ہے۔ ۲۷ (امام علیؑ)

۱۱۔ عقل عطیہ خداوندی ہے۔ ۲۸ (امام علیؑ)

۱۲۔ تمام چیزوں کا معیار عقل ہے ۲۹ (امام علیؑ)

۱۳۔عقل فکر کی رہنما ہے۔فکر دلوں کی رہنما ہے دل حواس کا رہنما ہے اور حواس جسم کے رہنما ہیں۔۳۰ (امام علیؑ)

۱۴۔ہر کام کی اصلاح عقل کرتی ہے۔۳۱ (امام علیؑ)

۱۵۔خیر کو جب تم سنو تو اس کی پیروی کرنے والوں کی طرح اسکے بارے میں غور وفکر کرو صرف روایت کرنے والوں کی طرح نہیں۔ بے شک علم کی روایت کرنے والے بہت ہیں لیکن اس کی پیروی کرنے والے بہت کم ہیں۔۳۲ (امام علیؑ)

۱۶۔عقل سب سے مضبوط بنیاد ہے۔۳۳ (امام علیؑ)

۱۷۔عاقل تیز دھار تلوار کی طرح ہوتا ہے۔۳۴ (امام علیؑ)

۱۸۔عقل کا ثمرہ حق کی پیروی ہے۔۳۵ (امام علیؑ)

۱۹۔عقل کا ثمرہ استقامت اختیار کرنا ہے۔۳۶ (امام علیؑ)

۲۰۔زمانے کی مشکلات میں سوائے عقل مندی کی مدد کے کوئی چارہ نہیں ہے۔۳۷ (امام علیؑ)

۲۱۔عقل جہاں بھی ہوگی بہترین مونس وہمدم ہوگی۔۳۸ (امام علیؑ)

۲۲۔حضرت جبرئیل حضرت آدمؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: اے آدمؑ! مجھ تک یہ فرمان پہنچا ہے کہ تم تین چیزوں میں سے ایک چیز چن لو۔حضرت آدمؑ نے کہا وہ کون سی تین چیزیں ہیں؟ کہا عقل، حیا اور دین۔ ایک کو لے لو اور دو کو چھوڑ۔دو نے کہا اے جبرئیل! ہمارے اوپر فرمان ہوا ہے کہ جہاں بھی عقل ہو ہم اسی کے ساتھ رہیں گے۔۳۹ (امام علیؑ)

۲۳۔کسی ایسی چیز کے ذریعہ عبادت نہیں کی گئی جو عقل سے افضل ہو اور مومن اس وقت تک عاقل نہیں ہوتا جب تک اس میں دس خصلتیں جمع نہ ہو جائیں۔خیر مومن کا عمل ہوتا ہے اور وہ شر سے محفوظ ہوتا ہے۔۴۰ (امام باقرؑ)

۲۴۔بے عقلی سے بڑی کوئی مصیبت نہیں ہے اور جب عقل نہیں ہوتی تو یقین میں کمی آجاتی

ہے۔ ۱؎ (امام باقرؑ)

۲۵۔ اگر عقل سالم ہو تو ہر کسی کو اپنی عمر کو غنیمت جاننا چاہئے۔ ۲؎ (امام باقرؑ)

۲۶۔ انسان کا رکن اساسی عقل ہے اور عقل ہی کے ذریعہ فہم فراست ہے، حفظ و علم ہے۔ جب عقل کی تائید نور کے ذریعہ ہو تو انسان عالم، حافظ، ذکی، چالاک اور سمجھ دار بھی ہوگا۔ درحقیقت عقل کے ذریعہ انسان کامل ہوتا ہے۔ عقل انسان کی رہنما اور اس کے لئے مشعل راہ اور اس کے تمام امور کی کنجی ہے۔ ۳؎ (امام باقرؑ)

۲۷۔ اے ہشام۔ جسم کا نور آنکھوں میں ہے۔ تو اگر آنکھیں روشن ہوں تو اس کے نور سے تمام جسم کو نور پہنچتا ہے اور روح کی روشنی عقل ہے۔ اگر انسان عاقل ہو تو اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کر لیتا ہے اور معرفت الٰہی کی مدد سے وہ دینی بصیرت حاصل کر لیتا ہے اور اگر کسی نے اپنے رب کو نہیں پہچانا تو اس کا دین باقی نہیں رہتا۔ بالکل اسی طرح سے جیسے جان کے بغیر جسم بے سود ہوا کرتا ہے خالص عقل کے بغیر استوار نہیں ہوتی۔ ۴؎ (امام کاظمؑ)

۲۸۔ عقل ہر انسان کی دوست اور جہالت و نادانی اس کی دشمن ہے۔ ۵؎ (امام رضاؑ)

حوالے:

۱۔ سورہ آل عمران (۳) ۱۶۴

۲۔ بحار جلد۔ ۱/ ۱۷۷ کتاب (غوالی اللئالی)

۳۔ اصول کافی۔ جلد ۱/ ۳۰

۴۔ روضۃ الواعظین۔/ ۳۰

۵۔ بحار۔ جلد ۱/ ۱۹۴ کتاب (کنز الفوائد)

۶۔ بصائر الدرجات/ ۳

۷۔ بحار۔ جلد ۸/ ۲۷۷ کتاب (اربعین) شیخ سعد الدین سوری)

۸۔ بحار۔ جلد۔ ۱/ ۱۷۷ کتاب (غوالی اللئالی)

۹۔ بحار۔ جلد ۱/ ۱۹۴ کتاب (غوالی اللئالی)
۱۰۔ ثواب الاعمال ۔ ۱۶۰
۱۱۔ خصال ۰/ ۳۹
۱۲۔ امالی شیخ صدوق/ ۵۵۱
۱۳۔ بحار۔ جلد ۱/ ۱۷۰ کتاب (امالی) شیخ طوسی
۱۴۔ سوری بقرہ (۲) ۱۶۴
۱۵۔ سورہ ملک (۶۷) ۱۰
۱۶۔ سورہ روم (۳۰) ۲۴
۱۷۔ سورہ نحل (۱۶) ۱۲
۱۸۔ تحف العقول/ ۴۴
۱۹۔ تحف العقول/ ۴۴
۲۰۔ بحار۔ جلد۔ ۱/ ۹۵ کتاب (الفوائد)
۲۱۔ بحار جلد ۱ (کتاب المحاسن)
۲۲۔ غرر الحکم/ ۲۰
۲۳۔ غرر الحکم/ ۱۴
۲۴۔ اصول کافی جلد۔ ۱/ ۲۷
۲۵۔ بحار۔ جلد ۷۸/ ۷ کتاب (مطالب السؤول)
۲۶۔ نہج البلاغہ/ ۱۱۰۴
۲۷۔ امالی (طوسی) جلد۔ ۱/ ۱۴۵
۲۸۔ غرر الحکم/ ۱۵
۲۹۔ غرر الحکم/ ۳۱۵

۳۰۔مستدرک نہج البلاغہ/ ۱۷۶
۳۱۔غرر الحکم/ ۳۰
۳۲۔نہج البلاغہ/ ۱۱۳۰
۳۳۔غرر الحکم/ ۳۱
۳۴۔غرر الحکم/ ۲۰
۳۵۔غرر الحکم/ ۱۵۸
۳۶۔غرر الحکم/ ۱۵۸
۳۷۔بحار جلد۔۷۸/ ۷(مطالب السؤل)
۳۸۔غرر الحکم/ ۲۷
۳۹۔امالی صدوق/ ۶۰۰
۴۰۔خصال/ ۳۳۴
۴۱۔تحف العقول/ ۲۰۸
۴۲۔غرر الحکم/ ۲۶۱
۴۳۔علل الشرائع جلد۔۱/ ۱۰۳
۴۴۔تحف العقول/ ۲۹۴
۴۵۔اصول کافی جلد۔۱/ ۱۱

☆☆☆☆☆☆☆

سیرہ و تاریخ:

آیت اللہ جعفر سبحانی

غزوۂ احزاب ۱

پیغمبر اکرمؐ نے ہجرت کے پانچویں سال مختلف غزوات کی قیادت فرمائی اور دشمن کی احتمالی سازشوں کو نیست و نابود کرنے کے لئے مختلف علاقوں میں حفاظتی دستے بھی روانہ کئے۔ ہجرت کے پانچویں سال رونما ہونے والی بعض جنگوں کا ذکر حاضر خدمت ہے۔

غزوۂ دومۃ الجندل:۲

مدینہ میں یہ اطلاع حاصل ہوئی کہ ''دومۃ الجندل'' میں ایک گروہ عام لوگوں اور مسافروں پر ظلم کر رہا ہے اور اس گروہ کے لوگوں کا یہ ارادہ ہے کہ مدینہ کا محاصرہ کر کے یہاں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیں۔ پیغمبر اسلامؐ نے اس گروہ سے لوگوں کو بچانے کا فیصلہ کیا اور ہزار سپاہیوں کے ہمراہ وہ مدینہ سے باہر نکل پڑے۔ وہ رات کی تاریکی میں سفر اور دن میں آرام کیا کرتے تھے۔ دشمنوں کو رسول اکرمؐ کی روانگی اور ان کے منصوبے کا پتہ چل گیا لہذا وہ لوگ فوراً متفرق ہو گئے۔ پھر بھی پیغمبر اکرمؐ کچھ دنوں تک قیام پذیر رہے اور احتمالی سازشوں کی نابودی کے لئے حفاظتی وفد بھی روانہ کئے۔ ۲۰ ربیع الاخر کو انہوں نے مدینہ واپس آنے کا ارادہ کیا اور لوٹتے وقت انہوں نے قبیلۂ ''فزارہ'' کے ایک شخص کے ساتھ معاہدہ پر دستخط کئے اور قحط و خشک سالی میں مبتلا اس قبیلے کو مدینہ کی چراگاہوں کو استعمال کرنے کی اجازت بھی دیدی۳

غزوۂ خندق:

جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ہجرت کے چوتھے سال معاہدہ شکنی کی وجہ

سے پیغمبر اسلامؐ نے ''بنی النضیر'' نامی یہودی قبیلے کے لوگوں کو مدینہ سے باہر نکال دیا تھا اور ان لوگوں کی کچھ املاک بھی ضبط کرلی تھی۔مدینہ سے نکلنے کے بعد بنی النضیر قبیلے کے لوگوں کے پاس اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارۂ کار نہ رہ گیا تھا کہ وہ خیبر نامی علاقے میں سکونت اختیار کرلیں یا شام کی طرف چلے جائیں۔پیغمبر اکرمؐ کا یہ انقلابی عمل اس مخصوص معاہدہ کے مطابق تھا جس پر طرفین پوری طرح راضی اور اپنی دستخط بھی کر چکے تھے ۔ اسی انقلابی اقدام کی وجہ سے قبیلہ بنی نضیر کے سرداروں نے ایک منصوبہ بند سازش کے تحت مکہ جانے کا ارادہ کرلیا تاکہ وہ ''محمدؐ'' کے خلاف جنگ کرنے کے لئے قریش کی حوصلہ افزائی کرسکیں جس کی تفصیلی وضاحت حاضر خدمت ہے۔

عرب کی مشرک اور یہودی طاقتوں کو اس اسلام مخالف جنگ کے لئے پوری طرح آمادہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے ایک طاقتور فوجی جماعت تشکیل دی اور تقریباً ایک مہینے تک مدینہ کا محاصرہ جاری رکھا۔ چونکہ اس جنگ میں مختلف گروپ اور پارٹیاں شامل تھیں اور مسلمانوں نے دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے مدینہ کے اطراف میں خندق کھودی تھی اسی وجہ سے اس کو جنگ احزاب اور کبھی کبھی جنگ خندق کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ''بنی النضیر'' اور ''بنی وائل'' نامی یہودی قبیلوں نے اس جنگ کی آگ کو بھڑکانے میں نمایاں کردار انجام دیا تھا۔قبیلہ بنی النضیر کے یہودیوں کو مسلمانوں کے ذریعہ جو گہری چوٹ لگی تھی وہ مدینہ سے ان لوگوں کا اخراج تھا۔ ان میں سے کچھ لوگ خیبر کے علاقے میں آباد ہوگئے تھے۔ بہر حال ان لوگوں نے اسلام کی نابودی کے لئے ایک حیرت انگیز اور منصوبہ بند سازش تیار کی اور مسلمانوں کو مختلف جماعتوں اور گروہوں کے خلاف ایسی جنگ ونبرد آزمائی کے لئے مجبور کر دیا جس کی مثال تاریخ عرب میں موجود نہ تھی۔

اس منصوبے میں متعدد عرب گروہ اور جماعتیں یہودیوں کی طرف سے فراہم کی گئی

اقتصادی اور مالی حمایت و سرپرستی سے مالامال تھیں اور ان لوگوں کو ہر طرح کے فوجی وسائل وامکانات بھی دستیاب تھے۔

منصوبہ یہ تھا کہ قبیلہ بنی النضیر کے کچھ سردار مثلاً سلام بن ابی الحقیق" اور "حی بن اخطب" نامی لوگ ایک وفد کے سربراہ کی حیثیت سے شہر مکہ میں داخل ہوئے اور سرداران قریش سے ملاقات وگفتگو کی۔ دوران گفتگو ان لوگوں نے کہا کہ محمد نے تمہیں اور ہم لوگوں کو نشانہ بنا رکھا۔ اور "بنی قینقاع" وبنی النضیر" قبیلے کے یہودیوں کو ترک وطن کے لئے مجبور کردیا۔ جماعت قریش سے وابستہ آپ سبھی لوگ مقابلے کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ اپنے ہم معاہدہ قبیلوں سے مدد حاصل کیجئے۔ بنی قریظہ کے ۷۰۰ شمشیرزن یہودی مدینہ کے قریب موجود ہیں اور اشارہ ملتے ہی وہ سب آپ لوگوں کی مدد میں سرگرم ہوجائیں گے۔ قبیلہ بنی قریظہ کے لوگوں نے ظاہری اعتبار سے محمد کے ساتھ معاہدہ کررکھا ہے لیکن ہم لوگ انہیں اس بات کے لئے آمادہ کرلیں گے کہ وہ اس دفاعی معاہدہ کونظر انداز کرتے ہوئے تم لوگوں کے ساتھ رہیں۔ ۲؎

ان لوگوں کی لمبی لمبی باتوں سے سرداران قریش بہت متاثر ہوئے کیونکہ وہ مسلمانوں کے خلاف جنگ ونبرد آزمائی سے پوری طرح تھک چکے تھے۔ آخرکاران لوگوں نے یہودیوں کے اسلام دشمن منصوبے کوتسلیم کرتے ہوئے ان کی حمایت کرنے کے لئے اپنی رضامندی ظاہر کردی لیکن اپنی موافقت ورضامندی کا اعلان کرنے سے پہلے ان لوگوں نے یہودی سرداروں سے پوچھا:

"تم لوگ اہل کتاب اور آسمانی کتابوں کے پیرو ہو اورحق وباطل کی شریعتوں سے بخوبی واقف اور دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرسکتے ہو۔ تم لوگوں کو اس بات کا بھی بخوبی علم ہوگا کہ ہم لوگوں کا "محمد" سے اس کے علاوہ کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ان کا دین وآئین ہمارے دین وآئین کے خلاف ہے۔ لہٰذا آپ لوگ سچ سچ بتائیں کہ ہم لوگوں کا دین بہتر ہے

یا ان کا دین جو وحدانیت و یکتا پرستی کی بنیادوں پر قائم ہے۔''؟

اب یہ دیکھنا چاہئے کہ خود کو وحدانیت و یکتا پرستی کا علمبردار کہنے والا گروہ اس جاہل و ناواقف جماعت کے سوال کا کیا جواب دیتا ہے۔ واضح رہے کہ ناواقف جماعت قریش نے ان لوگوں کو واقف کار و عالم جانتے ہوئے اپنے مسائل ان کے سامنے پیش کردئے تھے۔ اور ان لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ لیکن ان لوگوں نے نہایت بے شرمی کے ساتھ جماعت قریش کو جواب دیا کہ آئین بت پرستی محمد کے دین و آئین سے بہتر ہے لہٰذا تم لوگوں کو اپنے مذہب پر ثابت قدم رہنا چاہئے اور ان کے دین کی طرف ہرگز مائل نہ ہونا چاہئے۔''[۵]

ان لوگوں نے اپنے اس جواب سے نہ صرف یہ کہ اپنا دامن داغدار کرلیا بلکہ تاریخ یہودیت کے سیاہ چہرے کو اور زیادہ سیاہ اور بدنما بنادیا۔ ان کی یہ لغزش ایک ایسا ناقابل معافی گناہ ہے جس پر یہودی دانشور آج بھی گہرے اور غیر معمولی افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اسرائیل اپنی کتاب 'تاریخ یہود ان وعربستان'' میں لکھتے ہیں:

''یہودیوں کے لئے ایسی غلطی کرنا ہرگز مناسب نہیں تھا چاہے قریش ان کے مطالبے کو رد کیوں نہ کردیتے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قطعی مناسب نہ تھی کہ یہودی قوم بت پرستوں کی آغوش میں پناہ حاصل کرے کیونکہ ان لوگوں کا یہ رویہ تورات کی تعلیمات کے برعکس ہے۔''[۶]

درحقیقت یہ وہ طریقہ کار ہے جس کو موجودہ مادیت پرست سیاسی ماہرین اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی تکمیل و ترقی کے لئے استعمال کررہے ہیں۔ ان کا عقیدہ و ایمان ہے کہ مقصد کی تکمیل و ترقی کے لئے ہر جائز و ناجائز وسیلہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے جیسا کہ اس مکتب فکر کے پرچمدار ''ماکیاول'' کہتا ہے کہ ''مقصد وسیلہ کی توجیہ کرتا ہے۔'' اور ان لوگوں کے مکتب فکر میں اخلاق وہ چیز ہے جو ان کے مقصد کو عملی رنگ و روپ عطا کرنے میں مدد کرے۔

قرآن اس ناپسندیدہ وتلخ واقعہ کے سلسلے میں ارشاد فرماتا ہے: کیا تم ان لوگوں کو نہیں دیکھتے ہو جو کتاب سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور بت پرستوں کی تصدیق کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ وہ لوگ یکتا پرست مومنین سے زیادہ نجات یافتہ ہیں۔'' ۷

ان نام نہاد عالموں کی بات ان بت پرستوں پر بہت اثر انداز ہوئی لہٰذا ان لوگوں نے یہودیوں کے ساتھ اپنی موافقت ورضامندی کا اعلان کردیا۔ اس کے بعد دو جماعتوں کے درمیان مدینہ کی طرف روانگی کا وقت بھی طے ہوگیا۔

جنگ کی آگ بھڑکانے والے غیر معمولی مسرت وشادمانی کے ساتھ مکہ سے باہر تشریف لائے اور نجد کی طرف چل پڑے تا کہ اسلام سے غیر معمولی عداوت رکھنے والے قبیلہ ''غطفان'' سے بھی ملاقات وگفتگو کرلیں۔قبیلہ غطفان سے جڑے ہوئے '' خانوادہ بنی فزارہ، بنی مرہ اور بنی اشجع'' نے ان لوگوں کی درخواست قبول کرلی لیکن اس شرط کے ساتھ کامیابی حاصل ہونے کے بعد خیبر کے علاقہ کا ایک سال کا محصول انھیں دیدیا جائے گا۔لیکن بات اسی جگہ ختم نہیں ہوئی بلکہ قریش نے اپنے ہم معاہدہ ''بنی سلیم'' اور غطفان نے اپنے ہم پیمان ''بنی اسد'' کے پاس مکتوب روانہ کرتے ہوئے انھیں بھی اس متحدہ فوجی محاذ میں شامل ہونے کی دعوت دیدی اور ان لوگوں نے اسلام کے خلاف اس متحدہ فوجی جماعت میں شامل ہونے کی بات مان لی اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق یہ سبھی جماعتیں عربستان کے مختلف علاقوں سے ایک سیلاب کی طرح مدینہ کا محاصرہ کرنے اور اس پر فتح حاصل کرنے کے لئے امنڈ پڑیں۔۸

مسلمانوں کا اطلاعاتی نظام:

شہر مدینہ میں سکونت اختیار کرنے کے بعد پیغمبر اسلامؐ اپنے ماہر ومعتمد افسران کو اپنے اطراف کے علاقوں میں برابر ارسال کیا کرتے تھے تا کہ وہ لوگ وہاں کی تازہ ترین صورتحال پر نگاہ رکھیں اور لوگوں میں رونما ہونے والے غیر اسلامی جوش وخروش سے بھی انھیں آگاہ

کرتے رہیں۔ چنانچہ اطلاعاتی جماعت سے وابستہ افراد و افسران نے یہ خبر دی کہ اسلام کے خلاف ایک طاقتور فوجی جماعت کی تشکیل عمل میں آچکی ہے اور اس متحدہ فوجی جماعت میں شامل لوگ وقت معینہ پر شہر مدینہ کا محاصرہ کرلیں گے۔ پیغمبرؐ نے فوری طور پر ایک دفاعی کاؤنسل کی تشکیل کردی تاکہ میدان احد میں تلخ تجربہ سے دوچار ہونے کے بعد وہ پوری ہوشیاری ومہارت سے کام لے سکیں۔ کچھ لوگوں نے قلعہ داری اور بلند مقامات پر محاذ آرائی کے ذریعہ دشمن کا مقابلہ کرنے کی بات رکھی اور یہ کہا مدینہ کے باہر جاکر دشمن کا مقابلہ کرنے سے بہتر یہی ہوگا کہ اونچے مقامات پر گھات لگا کر مقابلہ کیا جائے۔ لیکن یہ منصوبہ قطعی کافی نہ تھا کیونکہ ہزاروں اسلام دشمن فوجیوں کے سامنے قلعہ داری اور بلندی پر گھات لگانے والی ترکیب کارگر ثابت ہونے والی نہیں تھی لہٰذا دفاعی شوریٰ کو ایسی حکمت عملی درکار تھی کہ دشمن کی فوج مدینہ کے قریب نہ آسکے۔

سلمان فارسی ایران کے جنگی علوم وفنون سے بخوبی واقف تھے چنانچہ انھوں نے ان لوگوں سے بتایا کہ سرزمین ایران میں جب لوگوں کو دشمن کے خطرناک حملوں کا سامنا ہوتا تھا تو وہ شہر کے چاروں طرف گہری خندق کھود دیا کرتے تھے جس کی وجہ سے دشمن کی پیش قدمی میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی۔ لہٰذا شہر کے چاروں طرف گہری خندق کا حصار قائم کرکے مدینہ کی طرف ان کی پیشروی کو روک دیا جائے اور خندق کے اطراف میں دفاعی چھاؤنیوں کے قیام کے ساتھ ساتھ اطراف میں واقع پہاڑ کی اونچی چوٹیوں سے فوج دشمن پر سنگ باری اور تیر اندازی کی جائے تاکہ وہ لوگ خندق کو پار کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔[۹]

سلمان فارسی کی یہ تجویز اتفاق رائے سے منظور ہوگئی اور ان کے دفاعی منصوبے نے اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت میں موثر کردار ادا کیا۔ قابل توجہ بات یہ تھی کہ پیغمبر اکرمؐ نے دفاعی جماعت کے کچھ لوگوں کے ساتھ بذات خود کمزور علاقوں کا جائزہ لیا اور خود ہی خندق کی جگہ کی نشاندہی بھی کردی یہ طے پایا کہ ''احد'' سے لیکر ''راتج'' تک خندق کھودی جائے اور نظم

ضبط قائم رکھنے کے لئے ہر چالیس میٹر کے فاصلے پر دس دس سپاہی تعینات کر دیئے جائیں۔ خندق کھودنے کے لئے پہلا پھاوڑا خود پیغمبرؐ نے مارا اور اس طرح خندق کی کھدائی کا کام شروع ہوگیا۔ وہ زمین کی کھدائی میں لگے ہوئے تھے اور حضرت علیؑ گڑھے سے مٹی نکالتے جارہے تھے۔ ان لوگوں کے چہرے اور پیشانی سے پسینہ جاری تھا اور پیغمبر باربار اپنی زبان سے یہ جملہ دہراتے جارہے تھے۔ ''لا عیش الا عیش الآخرہ اللهم اغفر الانصار المهاجرة۔ یعنی حقیقی زندگی تو آخرت کی زندگی ہے۔ پروردگار! مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔''

پیغمبرؐ نے اپنے اس عمل سے اسلامی منصوبے کی ایک جھلک پیش کردی اور اسلامی معاشرہ کو یہ بات بخوبی سمجھادی کہ جماعت کے سردار اور فوج کے سپہ سالار کو دیگر افراد کی طرح ایک دوسرے کے غم میں شریک رہنا چاہیے اور ہمیشہ اس بات کے لئے کوشاں رہنا چاہئے کہ لوگوں کے کندھوں پر زیادہ بوجھ نہ آنے پائے۔ خندق کی کھدائی میں پیغمبرؐ کی شرکت نے لوگوں کے جوش وخروش میں غیر معمولی اضافہ کردیا او سبھی لوگ غیر معمولی لگن کے ساتھ اس کام میں ہمہ تن سرگرم ہوگئے یہاں تک کہ قبیلہ بنی قریظہ کے یہودیوں نے بھی، جو مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرچکے تھے، اس دفاعی کام میں مسلمانوں کی مدد میں مصروف ہوگئے۔[۱۰]

اس زمانے کے مسلمان سازوسامان کے اعتبار سے حیرت انگیز ومشکلات مسائل سے دوچار تھے پھر بھی وہاں آباد لوگ سپاہیان اسلام کی مدد میں لگے ہوئے تھے۔ جب کبھی خندق کی کھدائی کے دوران کوئی چٹان آجاتی تھی تو پیغمبر بذات خود کھدائی میں لگ جاتے تھے اور لگاتار چوٹ کے ذریعہ بھاری پتھر کو چکنا چور کردیتے تھے۔

خندق کی لمبائی کا اندازہ اس کی کھدائی میں لگے ہوئے افراد کی تعداد سے کیا جاسکتا ہے۔ مشہور قول کے مطابق اس وقت مسلمانوں کی کل تعداد ۳۰۰۰ افراد پر مشتمل تھی[۱۱] یہ طے ہوا تھا کہ ۴۰ میٹر خندق کی کھدائی دس لوگوں کے ذمہ ہوگی۔ اس طرح کل لمبائی ۱۲۰۰۰ میٹر یعنی تقریباً ساڑھے پانچ کیلومیٹر ہوجائے گی۔ اس کے علاوہ خندق کی چوڑائی اتنی تھی کہ چابک

دست اور غیر معمولی مہارت رکھنے والے سوار بھی اپنے گھوڑے کے ساتھ اس کو پار نہیں کر سکتے تھے۔فطری اندازہ کے بموجب خندق کی چوڑائی اور گہرائی بھی کم سے کم پانچ میٹر ہونی چاہیے۔

سلمان کے بارے میں پیغمبرؐ کا مشہور جملہ:

خندق کی کھدائی کے لئے افراد کی تقسیم کے دوران انصار اور مہاجرین کے درمیان بحث چھڑ گئی۔دونوں یہ کہہ رہے تھے کہ سلمان ہم لوگوں کے درمیان سے ہیں لہٰذا انھیں ہماری مدد کرنی چاہیے اور خندق کی کھدائی میں ہمارا ساتھ دینا چاہیے۔پیغمبر اکرمؐ نے انصار و مہاجرین کے جھگڑے کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"سلمان منا اهل البيت۔"[۲]

پیغمبرؐ شب و روز خندق کے قریب ہی موجود رہا کرتے تھے تاکہ اس کی کھدائی کا کام جلد از جلد پورا ہو جائے لیکن منافقوں کی جماعت کام میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لئے مختلف النوع بہانہ تراشیوں میں سرگرم تھی اور اکثر کسی اطلاع و اجازت کے بغیر یہ منافقین اپنے گھر چلے جایا کرتے تھے لیکن صاحبان ایمان افراد اٹل ارادے اور غیر معمولی حوصلے کے ساتھ خندق تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے اور اگر انہیں کوئی ضرورت پیش آتی تو سپہ سالار سے اجازت لے کر جایا کرتے تھے اور ضرورت پوری ہوتے ہی دوبارہ اپنے کام میں لگ جاتے تھے۔سورۂ نور کی ۶۲ ویں اور ۶۳ ویں آیات میں اس واقعہ کی مکمل وضاحت موجود ہے۔

عرب و یہودی سپاہ کے ذریعہ مدینہ کا محاصرہ:

سپاہ عرب نے چیونٹی اور ٹڈی کی طرح اس گہری خندق کے قریب ہی پڑاؤ ڈال دیا جو ان کی آمد وہیں سے چھ روز قبل ہی تیار ہو چکی تھی۔ان لوگوں کا اندازہ تھا کہ کوہ احد کے دامن میں انہیں لشکر اسلام کا مقابلہ کرنا ہوگا لیکن احد کے علاقے میں داخل ہونے کے بعد بھی انھیں کوئی مسلمان سپاہی نظر نہ آیا۔میدان خالی پا کر وہ لوگ خندق کے قریب تک بڑھتے چلے آئے اور مدینہ کے ارد گرد گہری خندق دیکھ کر وہ لوگ حیران رہ گئے۔وہ لوگ جیسا ختہ کہنے

لگے کہ ''محمد'' نے یہ جنگی تکنیک کسی ایرانی سے سیکھی ہے کیونکہ عربوں کو جنگ کا یہ ہنر بالکل نہیں معلوم۔

طرفین کی فوجی صلاحیت کا تجزیہ:

عربوں کی فوج میں ۱۰،۰۰۰ سے زیادہ فوجی موجود تھے اور ان کی تلواروں کی چمک سے خندق کے اس پار موجود لوگوں کی آنکھیں چکا چوند ہورہی تھیں۔ مقریزی کا بیان ہے کہ تین سو گھوڑوں اور ڈیڑھ ہزار اونٹوں کے ساتھ تقریباً ۴۰۰۰ فوجی لشکر قریش میں شامل تھے اور ان لوگوں نے خندق کے قریب پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ اس کے علاوہ خانوادہ بنی سلیم، جو قریش کے ہم معاہدہ تھے، ۷۰۰ فوجیوں کے ساتھ ''مرا الظہران'' میں ان کے ساتھ شامل ہوگئے تھے۔ اس کے علاوہ خانوادہ بنی فزارہ کے ۱۰۰۰ فوجی اور ''بنی اشجع'' و ''بنی مرہ'' کے چار چار سو فوجی اور دیگر خاندان کے ۳۵۰۰ افراد جن کی مجموعی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہ تھی، دوسری طرف خیمہ لگا رکھا تھا۔

دوسری طرف مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۳۰۰۰ سے زیادہ نہ تھی۔ پہاڑ کے دامن میں واقع ''سلع'' نامی اونچی چوٹی پر ان لوگوں کی دفاعی چھاؤنی تھی۔ اس جگہ سے نہ صرف خندق بلکہ اس کے باہر کا علاقہ بھی ان لوگوں کی دسترس میں تھا اور اس جگہ سے فوج دشمن کی نقل وحرکت اور ان کی جملہ سرگرمیوں پر کڑی نگاہ کی رکھی جاسکتی تھی۔ مسلمانوں کی ایک جماعت کو اس کام پر تعینات کیا گیا تھا کہ وہ خندق کی حفاظت اور اس جگہ پر ہونے والی نقل وحرکت پر نگاہ رکھیں چنانچہ یہ لوگ اپنے فطری محاذوں اور غیر فطری چھاؤنیوں سے اپنی دفاعی سرگرمیوں کی مدد سے دشمن کو خندق پار نہیں کرنے دیتے تھے۔ اور وہ سپاہ اسلام کے خلاف اپنی حملہ آورانہ سرگرمیوں میں پوری طرح ناکام تھے۔

مشرکین کی فوج تقریباً ایک مہینے تک خندق کے قریب پڑاؤ ڈالے رہی لیکن معدودے چند افراد کے علاوہ لوگ خندق پار نہ کرسکے۔ جیسے ہی وہ لوگ خندق پار کرنے کے

لئے آگے بڑھتے تھے بلندیوں پر تعینات دفاعی فوجیوں کی سنگ باری کی وجہ سے، جو موجودہ زمانہ کی گولا باری سے کم نہ تھی، ان لوگوں کو پیچھے ہٹنا پڑتا تھا۔ اس مدت کے دوران مسلمان، حملہ آور عرب فوجیوں کے ہمراہ دلکش داستان کے حامل رہے ہیں جن کا تذکرہ کتاب تاریخ میں باقاعدہ درج ہے۔[۳۱]

ٹھنڈک کا خطرہ اور خوراک وچارے کی کمی:

جنگ احزاب کے موقع پر سردی کا موسم قریب تھا۔ اس سال بارش کی کمی کی وجہ سے مدینہ واس کے اطراف میں قحط جیسی کیفیت نظر آرہی تھی اور دوسری طرف مشرکین کی سپاہ اپنے ساتھ کھانے پینے کا جو سامان لے کر آئی تھی وہ اتنا نہ تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک اس علاقے میں قیام کرسکیں۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ تقریباً ایک ماہ کی لمبی مدت خندق کے کنارے بسر کردیں گے بلکہ ان لوگوں کو یقین تھا کہ ایک ہی حملے میں وہ تمام مسلمانوں پر مسلط ہوکر انھیں اپنی تلواروں سے پوری طرح نابود کرڈالیں گے۔

جنگ کی آگ بھڑکانے والے لوگوں (یہودیوں) کو کچھ دنوں بعد اس پریشانی کا احساس ہوا اور وہ بخوبی سمجھ گئے کہ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ فوجی سپہ سالاروں کے ارادہ کی طاقت گھٹتی چلی جائے گی اور سردی میں اضافہ وچارا خوراکی سازوسامان کی قلت کی وجہ سے فوجیوں میں مقابلہ کی طاقت بھی باقی نہ رہ جائے گی لہٰذا ان لوگوں نے یہ سوچا کہ مدینہ کے اندر موجود قبیلہ بنی قریظہ سے مدد طلب کریں تاکہ جنگ کی آگ مدینہ کے اندر بھڑکائی جاسکے اور لشکر عرب کے لئے مدینہ کے اندر داخل ہونے کا راستہ بھی نکل آئے۔

حُیَیّ بن اخطب قلعہ بنی قریظہ میں داخل ہوتا ہے:

"بنی قریظہ" وہ تنہا یہودی قبیلہ تھا جو مدینہ میں مسلمانوں کے ہمراہ صلح وسلامتی کے ساتھ زندگی بسر کررہا تھا۔ اس قبیلے کے لوگوں نے "محمدؐ" کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اس کا باقاعدہ احترام کرنا اپنا فریضہ سمجھ رکھا تھا۔

اخطب کے بیٹے نے محسوس کیا کہ کامیابی کا واحد راستہ یہ ہے کہ سپاہ عرب کے لئے مدینہ کے اندر سے مدد حاصل کی جائے۔ اس نے قبیلۂ بنی قریظہ کے لوگوں کو معاہدہ شکنی کی دعوت دی تا کہ یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان مدینہ کے اندر جنگ چھڑ جائے اور جب مسلمان داخلی جنگ میں سرگرم ہوجائیں تو مدینہ کے باہر حملے کی تاک میں لگی ہوئی سپاہ عرب مسلمانوں پر بڑی آسانی سے غلبہ حاصل کر لے۔ اس منصوبے کے ساتھ وہ قلعہ کے دروازہ کے قریب پہونچ گیا اور ان لوگوں کے سامنے اپنا تعارف پیش کیا۔ ''کعب'' قبیلہ بنی قریظہ کا سردار تھا۔ اس نے حکم دیا کہ قلعہ کا دروازہ نہ کھولیں۔ لیکن ابن اخطب نے بڑی عاجزی کے ساتھ اسے غیرت دلاتے ہوئے کہا۔'' اے کعب! تو اپنی روزی وروٹی کے ڈر کی وجہ سے دروازہ کھولنے سے منع کررہا ہے۔'' اس کے اس جملے نے کعب کے جزبات کو برانگیختہ کردیا چنانچہ اس نے حکم دیا کہ دروازہ کھول دیا جائے۔ قلعہ کا دروازہ کھول دیا گیا اور جنگ کی آگ کو شعلہ ور کرنے والا یہودی اپنے ہم مسلک ''کعب'' کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے کعب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''میں عزت وعظمت کی دنیا لیے ہوئے تمہارے پاس آیا ہوں۔ قریش کے سردار، نامور عرب سپہ سالار اور غطفان کے امراء پورے جنگی سامان کے ساتھ ہم لوگوں کے مشترکہ دشمن ''محمد'' کو نابود کرنے کے لئے خندق کے اس پار فوجی پڑاؤ ڈال رکھا ہے ان لوگوں نے ہم سے یہ وعدہ کررکھا ہے کہ محمد اور مسلمانوں کا قتل عام کیے بغیر یہ لوگ اپنے گھر واپس نہ جائیں گے۔''

کعب نے اس کو جواب دیتے ہوئے کہا۔'' خدا کی قسم! تو ذلت ورسوائی کی دنیا لئے ہوئے میرے پاس آیا ہے۔ میری نگاہوں میں سپاہ عرب کی حیثیت ان بادلوں جیسی ہے جو گرجتے تو ہیں لیکن برستے نہیں ہیں۔ اے اخطب کے فرزند! اور اے جنگ کی آگ بھڑکانے والے! تو میرا پیچھا چھوڑ دے۔ محمد کی اخلاقی فضیلتیں ایسی ہیں جن کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ہم لوگ ان کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ ہم لوگوں نے ان کے اندر صدق

وصفا اور نیکی و پاکیزگی نفس کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔ آخر ہم لوگ ان کے ساتھ خیانت کیسے کریں۔؟

ابن اخطب ایک ماہر چاپلوس کی طرح کعب کی خوشامد کرنے لگا اور اس کو اتنی دیر تک سبز باغ دکھاتا رہا کہ آخر کار کعب معاہدہ شکنی پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر سپاہ عرب ''محمد'' پر غلبہ نہ حاصل کرسکی تو وہ خود بھی قلعہ کے اندر ان لوگوں کے ساتھ آجائے گا۔ کعب نے حیی کی موجودگی میں دیگر یہودی سرداروں کو طلب کیا اور ان سے مشورہ کرنا چاہا۔ ان لوگوں نے کہا کہ اس سلسلے میں آپ کی رائے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں گے ہم لوگ اسی فیصلے پر اٹل رہیں گے۔''[۱۴]

''زبیر باطا'' نامی ایک بوڑھے یہودی نے کہا کہ'' میں نے توراۃ میں پڑھا ہے کہ آخری زمانہ میں سرزمین مکہ میں ایک پیغمبر کا ظہور ہوگا۔ وہ مدینہ کی طرف ہجرت کرے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا دین پوری دنیا پر چھا جائے گا۔ اور دنیا کی کوئی بھی فوج اس کا مقابلہ نہ کرسکے گی۔ اگر محمد وہی پیغمبر ہوئے تو یہ فوج ان کا مقابلہ نہ کرپائے گی اور نہ ان پر غلبہ حاصل کرپائے گی۔ فرزند اخطب نے فوراً جواب دیتے ہوئے کہا۔ وہ پیغمبر بنی اسرائیل سے ہوگا اور محمد تو اسماعیل کی اولاد میں ہیں اور مکروجادو کے ذریعہ انھوں نے اپنے اردگرد لوگوں کی ایک جماعت اکٹھا کرلی ہے۔ بہر حال فرزند اخطب نے ان لوگوں سے اتنی دیر تک گفتگو کی ان لوگوں نے معاہدہ شکنی کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اسکے بعد اس نے محمد اور ان لوگوں کے درمیان جو معاہدہ لکھا گیا تھا اسے طلب کیا اور ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے اسے پھاڑتے ہوئے کہا۔ ''معاملہ ختم ہوگیا۔ تم لوگ جنگ کے لئے آمادہ ہوجاؤ''[۱۵]

حوالے:

۱۔ ابن ہشام نے اپنی کتاب میں اس غزوہ کی تاریخ ماہ شوال پانچویں ہجری لکھی ہے۔ غزوہ احزاب کے خاتمہ کی تاریخ ۲۴/ ذی القعدہ تھی اور محاصرہ کی مدت بھی تقریباً ایک ماہ رہی

ہے۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جنگ ۲۴ شوال کو شروع ہوئی تھی۔

۲۔ دمشق کے قریب میں واقع ایک علاقہ کا نام ہے اور دونوں علاقوں کے درمیان موجود فاصلہ پانچ دون میں طے کیا جاتا تھا اور اس جگہ سے مدینہ کی دوری پندرہ دنوں میں طے کی جاتی تھی۔ طبقات ابن سعد جلد دوم ص ۴۴

۳۔ طبقات ابن سعد جلد ۲ ص۔ ۴۴ اور سیرۂ ابن ہشام جلد ۲ ص۔ ۲۱۳

۴۔ مغازی واقدی جلد دوم ص۔ ۴۴۱

۵۔ سیرۂ ابن ہشام جلد ۲ ص۔ ۲۱۴، تاریخ طبری جلد ۲ ص۔ ۲۳۳

۶۔ حیات محمد، ص۔ ۲۹۷

۷۔ "الم ترا الی الذین... آمنوا سبیلا۔" سورۂ نساء آیت ۵۱

۸۔ مغازی واقدی جلد ۲ ص۔ ۴۴۳

۹۔ تاریخ طبری جلد ۲ ص ۲۲۴

۱۰۔ مغازی جلد ۲ ص۔ ۴۴۵

۱۱۔ سیرہ ابن ہشام جلد ۲ ص۔ ۲۲۰ و مغازی جلد ۲ ص۔ ۴۵۳

۱۲۔ سیرۂ ابن ہشام جلد ۲ ص۔ ۲۳۸

۱۳۔ مغازی واقدی جلد ۲ ص۔ ۴۵۵۔۴۵۶

☆☆☆☆☆

پروفیسر سید امیر حسن عابدی، دہلی یونیورسٹی

آصف سابع اور مولانا ناصر حسین

چونکہ میں ابتدائی زندگی میں لکھنؤ میں رہا ہوں اس لئے وہاں کی تہذیبی اور ثقافتی مجلسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ نیز وہاں کی تمام مقتدر ہستیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ اس وقت لکھنؤ کے سب سے بڑے مجتہد شمس العلماء مولانا ناصر حسین صاحب ہی تھے جن کو ناصر الملت کہا جاتا تھا۔ ان کے والد مولانا حامد حسین علیہ صاحب نے "عبقات الانوار" جیسی بلند پایہ کتاب کی تصنیف شروع کی تھی، نیز ان کے بعد مولانا ناصر حسین صاحب نے اپنے والد ہی کے نام سے جاری رکھا۔ کھجوہ محلّہ میں ان کا بہت بڑا کتب خانہ بھی تھا، جس کے انچارج ان کے بھتیجے حکیم ساجد حسین صاحب تھے۔ مجھے ناصر الملت کو دیکھنے کا بارہا موقع ملا، نیز ان کے یہاں کی محفلوں میں شرکت نصیب ہوئی۔

میری ابتدائی طالب علمی کے زمانے میں آصف سابع نظام حیدر آباد نواب عثمان علی خاں لکھنؤ تشریف لائے نیز تمام علمی بزرگ ہستیوں سے ملاقات کی۔ اس وقت میں نے بھی دور سے ان کی زیارت کی تھی۔ ۱۹۴۴ میں جب میں حیدر آباد ریسرچ کے طالب علم کی حیثیت سے گیا تو کبھی کبھی شام کو ان کو گذرتے ہوئے دیکھتا تھا۔ آصف سابع بڑے علم دوست تھے، نیز علما کی بڑی قدر اور وظائف سے ان کی امداد کرتے تھے۔ مزاج شاہانہ اور فقیرانہ تھا۔

لکھنؤ کے علما میں مولانا ناصر حسین صاحب کے وہ بہت قایل تھے۔ نیز اپنا فارسی اردو کلام انہیں بھیجتے تھے۔ ان دونوں میں ذاتی نجی اور خصوصی تعلقات کا پتہ ان خطوط سے چلتا ہے جو اکثر ناصر الملت کو لکھتے رہتے تھے۔ ایسے خطوط بہت سادہ اور معمولی کاغذ پر ان کے ہاتھ

سے لکھے ہوئے خانہ فرہنگ ایران دہلی نو میں موجود ہیں۔ ان خطوط کے لئے نواب معمولی عام ڈاکخانہ والا لفافہ استعمال کرتے اور اس پر پتہ تک اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ہر لفافہ رجسٹرڈ بھیجا جاتا تھا۔ بہر حال انھیں سے کچھ خطوط کی نقل یہاں پیش کی جارہی ہے۔

۲۲ر صفر مولانا محترم

یہ سلام یوم اربعین یہاں طبع ہوا ہے، جسکی صاحبان علم وفضل داد دے رہے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو چند لایق بھروسہ لکھنؤ کے اخبارات میں طبع کی غرض سے دے دیجئے گا۔ مزاج شریف بخیر ہوگا۔

آصف سابع

سلام اربعین

مطلع

السلام ای ذات ذیشان السلام
برتو آن شاہ شہیدان السلام
لعل حکمت گشت ہم رنگ رموز
ای دُر دریائے عرفان السلام
سینہ ات پر فخر معنی نکات
این چہ صورت رحل قرآن السلام
ہر گلی محو سجودی بردرت
بلبلی بین ہم ثنا خوان السلام

مقطع

می دھد روحم چہ تبریکی شنو
جان عثمان بر تو قربان السلام

۷/ذی الحجہ

مولانا محترم

السلام علیکم ۔ ایک تازہ سلام بھیجا ہے ماہ محرم کا، جو کیم محرم کو طبع ہوگا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو چند رسالوں میں طبع کرنے کی غرض سے دے سکتے ہیں ۔ جو کہ ہمیشہ سے ماہ محرم میں طبع ہوا کرتے ہیں۔ امید ہے بخیر وعافیت ہوں گے۔

آصف ساقی

سلام بحضور لالۂ فخر نور وفیض گنجور و حمایۂ تسکین دل رنجور و برق خاطف در شب دیجور، علیہ راکہ صلوٰۃ والسلام

مطلع: ز آمد ماہ محرم تن بیجان گشتہ
قطرۂ اشک بشکل در غلطاں گشتہ

دیدہ گلہای چمن کردہ قبائے پارہ
در قفس سینہ زنان بلبل نالاں گشتہ

شاد و مسرور شدہ روح قتیلان بنگر
زیر حلقوم بہ وقیح رمان گشتہ

(بہ رنگ انار)

غم پروانہ بپا کرد چہ محشر ہیہات
خاک بہ سر تو نگر شمع شبستاں گشتہ

برسر طور تجلی چو شدہ بہر لقا
دم بخود بین تو عجب موسیٰ عمران گشتہ

آہ و زاری چہ کند بین تو صدور اصداف

غیر تسکین ہمہ قطرۂ نسیان گشتہ

مقطع: منہدم کردہ بن قصر امامت عثمان

خاین و فاسد و درکار لعینان گشتہ

خانگی

مولانا محترم شمس العلما ناصر حسین صاحب مجتہد العصر لکھنو

کیا مولوی صاحب نے میرے فارسی مضمون کو بہ عنوان سلطان العلوم کا فارسی شاہکار جس پر ہوش بلگرامی نے تبصرہ کیا تھا اردو میں اور جس کا میں نے فارسی میں ترجمہ کیا تھا دیکھا؟ اگر دیکھا ہے تو میں مولانا کی ذاتی رائے اسکے نسبت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ جب کبھی اس قسم کے مضامین یا غزلیات وغیرہ یہاں کے اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ تو میرے حسب الحکم... لکھنؤ بھجوادئے جاتے ہیں مولانا کے دیکھنے کے لئے۔

مرتضیٰ حسین ذاکر لکھنوی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ایک عرصہ سے مولانا کا مزاج علیل ہے۔ امید ہے کہ اب روبا صلاح ہوگا، کیونکہ میں مولانا کی ذات کو علمی دنیا میں مغتنمات سے سمجھتا ہوں،

زیادہ طالب دعائے خیر

آصف سابع

۱۶/ جون ۱۹۴۳ء ۱۵/ صفر ۱۳۶۲ھ

خانگی

خدمت شمس العلما مولوی ناصر حسین صاحب

مجتہد العصر لکھنؤ۔

خواجہ حسن نظامی کا اخبار منادی مورخہ ۲/ محرم، ۱۱ محرم، ۹ صفر کے پرچے اگر اب تک آپ کی نظروں سے نہیں گذرے ہیں تو خرید کرکے یا مدیر اخبار کے مکان سے طلب

کر کے غور سے دیکھیں۔ ان میں دو خطوط میرے ہیں۔... اور اپنی رائے سے مجھے عند الفرصت اطلاع دیجئے گا۔

دیگر یہاں ایام عزا کے موقع پر منجملہ دیگر سلاموں کے جو ایک سلام حال میں شائع ہوا ہے۔ اس کی یہاں بڑی شہرت ہے اور پڑھے لکھے طبقہ کی طرف سے تحسین و آفرین کی آواز بلند ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھتے ہیں تو چند بھروسے کے قابل اردو اخبارات میں طبع کے لئے اس سلام کی نقل دیدیجئے۔"

زیادہ والسلام

آصف سابع

سلام بحضور تشنہ کام وذی ہمام علیہ صلوات والسلام

مطلع: حفظ کن بہر خدا لفظ حدیث الثقلین
کن نظر جلوہ یکتا بہ لباس اثنین

لقب و شان کہ ہوید (۱) زعبائے خمسہ
جگر و جان نبی بودہ بلاشک سبطین

این چہ بار است کہ اطراف سرش می گردم
ذات او بود چہ مربوط بہ پشت کونین

مقطع: سرنیزہ کہ دہد زین تو گواہی عثمان
خواند مصحف تو مگر بود امام الحرمین

۸ر محرم

مولانا ی محترم

مزید تازہ۔ سلام منسلک ہے، بغرض اشاعت

رتبہ والسلام

سلام بہ پیشگاہ جگر گوشۂ رسول الثقلین و دلبند امام الحرمین علیہ وآلہ الصلوٰۃ والسلام

(بہ موقع یوم عاشورہ)

مطلع: بہر پرواز نگر جائے کہ رفتن اینجا
رشتۂ عمر ز مقراض گسستن اینجا
بیعت پیر مغان داد چہ فتویٰ بہ شنو
جام را ہم زمئے ناب کہ شستن اینجا
درغم ابن علی اشک کہ ریزد کوید
واجبی ہست گہرہا کہ بمفتن اینجا
شان این قصر معلّٰی از جام رفعت
مرکز پایہ بگفتہ کہ نشستن اینجا

مقطع: طوف مشہد دگرش دادن بوسہ عثمان
بہر آسایش ارواح کہ خفتن اینجا

۱۲ر ربیع الاول ۵۶ھ

مولوی ناصر حسین صاحب مجتہد العصر لکھنؤ

کیا مولانا نے میری مدون کی ہوئی دعائے قبورعربی ، جو کہ اخبار رہبر دکن میں مورخہ ۹ ر جمادی الاول ...شائع ہوئی ہے، اس کو دیکھا میں معلوم کرنا چاہتاہوں کہ اس کی

نسبت آپ کی کیا رائے ہے؟ کیونکہ جو جو صاحبان علم وفضل اس قسم کے تحریرات اظہار خیال کر رہے ہیں، ان کو رسالے کی شکل میں طبع کرنا ہے۔

زیادخواہان دعا
آصف سابع

دوسرے وہ خطوط ہیں جو مولانا ناصرحسین صاحب کے نواسے سے متعلق ہیں۔ مولانا کے داماد سید نجم الحسن صاحب حیدرآباد میں نظام کی ملازمت میں تھے۔ نیز ان کے صاحب زادہ اور ناصر الملت کے نواسے سید ضیاء الحسن صاحب مرحوم تھے، جن کی نسبت اور شادی وغیرہ میں نواب صاحب کو ایک خاص دلچسپی تھی۔ بہر حال ان سے متعلق جو خطوط ہیں، وہ یہاں نقل کئے جارہے ہیں۔

۲؍محرم ۶۰ھ
خدمت مولانا مجتہد العصر ناصرحسین صاحب
السلام علیکم
مزاج شریف، تازہ دو سلام منسلک ہیں بہ سلسلۂ سابق سلام بغرض اشاعت۔ امید ہے آپ کا نواسہ اچھا ہوگا بعد ختم اربعین۔ اگر وہ حیدرآباد آئے تو مناسب ہوگا، ماہ ربیع الاول میں۔

۴؍محرم ۶۰ھ
خانگی
خدمت مولانای محترم مولوی ناصرحسین صاحب مجتہد العصر لکھنؤ

السلام علیکم، مزاج شریف، اگر آپ کے نواسہ ضیاء الحسن کی نسبت کسی جگہ اب تک نہیں ہوئی ہے، تو کیا اس مسئلہ کو مجھ پر چھوڑا جائے گا کہ اس کا میں بطور خود انتظام کروں (اپنے صوابدید پر) اور بعد عقد لڑکے کے آذوقہ کا انتظام کروں (آئندہ ماہ رجب تک) چونکہ آپ اس کے بزرگ ہیں، اس لئے پہلے آپ سے استمزاج کرنا مناسب خیال کیا، قبل اس کے میں کوئی تجویز آپ کے سامنے پیش کروں۔

امید ہے کہ بعد عشرہ محرم فرصت سے مجھکو جواب دیا جائے گا۔ لڑکے کے اطوار درست ہونے سے اور نامی گرامی خاندان سے اس کا تعلق ہونے میں اس کے سود بہبود میں دلچسپی لینا چاہتا ہوں۔

باقی خیریت

آصف سابع

۵ ربیع الاول

تازہ دو غزلیں ارسال ہیں، سرفراز لکھنو میں طبع کی غرض سے ان کے نقول دے جائیں تو مناسب ہے۔

رتبہ والسلام

مکرر ابھی اپنے نواسہ کو حیدر آباد نہ بھجوائے جب تک میں اطلاع نہ دوں کہ میں دوسرے کاموں میں اس وقت مصروف ہوں۔

تیسرے وہ خطوط ہیں جو مادر دکن یعنی نواب صاحب کی والدہ سے متعلق ہیں۔ ان میں سے بعض کو یہاں دیا جا رہا ہے۔

خانگی:

مولانا محترم مولوی ناصر حسین صاحب

مجتہد العصر لکھنؤ

السلام علیکم مزاج بخیر یت

یہاں سے چند اخبارات کے پرچے آپ کے نام بھجوائے گئے تھے، جس میں تعمیر مسجد زہرا در حدود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (بغرض ایصال ثواب مادر دکن) کا اعلان درج تھا۔ اس تجویز سے سب ذی علم طبقہ کو اتفاق ہے کہ بیٹے نے ماں کی یادگار کو جس مذہبی رنگ میں قائم کیا ہے وہ ضرور قابل تحسین واقرین ہے۔ غالباً آپ کو بھی اس سے اتفاق ہوگا۔

دیگر اخبارات میں جو اعلان ہے اس کو طبع کی غرض سے اخبار سرفراز لکھنؤ کو دیدیا جائے تو مناسب ہوگا، تاکہ ہر طرف اس کی تشہیر ہوجائے۔

باقی جناب طالب دعا

آصف سابع

۲۱ ربیع الاول ۶۰ھ

مکرر ایک نظم بھیجی ہے مسجد زہرا کے متعلق۔ اس کی نقل اخبار سرفراز لکھنؤ کو طبع کی غرض سے دیدیا جائے۔

نظم در توصیف مسجد زہرا در حدود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مطلع: ضیا بنگر بہ مسجد در خرام است

بہ عظمت ثانی بیت الحرام است (مسجد زہرا)

حروف عین حرز کردہ قیامت

عجب جلوہ فگن بنگر بہ بام است

نمودہ صبح صادق گفت بشنو
صلوٰۃ و ذکر و تسبیح زشام است
الایا ایھا الساقی کوثر
مئے خم عذیر بجام است

متطع: کنیزے بحر دام خویش عثمان
بہ عالی درجہ فایز بامرام است

آمش امۃ الزھرا بیگم بود وہم عقائد مذہب امامیہ داشت مثل مادرش آمۃ الزینب بیگم

نواب صاحب جس لفافے میں ناصر الملت کو خطوط بھیجے تھے، اس میں بھی انتہائی خلوص اور درویشی وسادگی کا اظہار ہوتا تھا۔ لفافہ معمولی ڈاکخانے کا ہوتا تھا۔ البتہ رجسٹری ہوتا تھا۔ نیز تمام پتہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے، جس میں دفتر وغیرہ کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ مثلاً ایک لفافہ پر ہے:

۲/ جولائی Registered 986

Hyderabad Deccan.

خدمت شمس العلما مولوی ناصر حسین صاحب

مجتہد العصر، لکھنؤ

مہر 17 jan

Molvi Nasir Husain Sahib

Lucknow

15- Jan

لفافہ کے پیچھے یہ عبارت ہے:

"دستخط مبارک اعلیٰ حضرت دام ملکہ کہ ۲۷/ ماہ ذی القعدہ ۵۹ھ رسیدہ"

نواب صاحب کا حکم تھا کہ دائرۃ المعارف کی تمام مطبوعات مولانا کے کتب خانہ کے لئے بھیجی جائیں، جسکے منتظم مولانا کے بھتیجے حکیم سید ساجد حسین صاحب تھے، اس وقت نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر تعلیمات وعدالت وصدر نشین دائرۃ المعارف تھے۔ نیز دائرۃ المعارف کے انچارج سید ہاشم تھے۔

اس مجموعہ میں وہ خطوط نہیں ہیں جو ناصر الملت نواب صاحب کے خطوط کے جواب میں بھیجا کرتے تھے۔ وہ خود نواب صاحب کے ذخیروں میں محفوظ ہوگا۔ البتہ ذیل میں ایک مفصل خط کا خاکہ دیا جارہا ہے، جسے ناصر الملت کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادوں (نصیر الملت اور سعید الملت) نے نواب صاحب کو بھیجا تھا:

"بتاریخ ۱۵ شعبان المعظم"

بعد بجا آوری آداب بموقف شاہانہ و تقدیم تحیات بمعرض ملوکانہ بکمال اخلاص وعقیدت عرض ہے کہ اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ وسلطانہ واعلیٰ عفی جمیع الملوک عزہ وشانہ، کہ ذات والا صفات ہمایونی وہ ذات بابرکات ورحمت آیات ہے۔ جس کے سحاب فیض کرم سے نہ صرف رعایائے دکن، بلکہ جمیع مومنین ومسلمین ہندوستان وبیرون ہندوستان ہمیشہ مستفید ومستفیض ہوتے رہتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ جو نظر لطف شاہانہ ومرحمت ملوکانہ ہمارے خانوادہ پر ابتداء سے اب تک جاری وساری ہے اور اس کا تشکر سواء فریضۂ دعا گوئی کے جب اسلاف ادا نہ کرسکے تو ہم میں کیا طاقت ہے۔ سرکار ناصر الملت اعلیٰ اللہ مقامہ پر جو الطاف کرم تھے، وہ اظہر من الشمس ہیں۔ اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے اس امر کی حقیقی قدر سواء اہلبیت طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین کے کون جان سکتا ہے۔ کہ بمقتضائے ان المحب لمن یحب لمطیع، ان کی حقیقی محبت اور تاسی کا آئینہ مظہر صفات اعلیٰ حضرت کی

ذات ہمایونی اس طرح ہے کہ جس طرح اہلبیت طاہرین سلام اللہ علیہم اجمعین اپنے وابستگان ارتحال کے بعد ان کے اسلاف کو فراموش نہ فرماتے تھے، بالکل اسی طرح اعلیٰ حضرت خلد وسلطنتہ نے اخلاف سرکار ناصر الملت اعلیٰ اللہ مقامہ کو ان کے بعد فراموش نہیں فرمایا، بلکہ اس وقت کلمات تعزیت سے تسلی دی، جبکہ اسکی ضرورت تھی اور اس وقت عطایا مرحمت ہوئے جب ان کا وقت تھا۔

یہ اعلیٰ حضرت عی کی ذات والا صفات تھی، کہ ہر وقت انعقاد مجلس فاتحہ خوانی سوم وچہلم جو امداد ہوئی اور اس سے یہ تقریبات بخیر وخوبی انجام پذیر ہوئیں اور جب نعش مطہر آگرہ جارہی تھی، تو اوس وقت زرکثیر مالی امداد مرحمت ہوئی جس سے اس وقت کے تمام مراحل بہترین طریقے سے طے ہوئے علاوہ بریں اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملک وسلطنتہ کے ان عنایات ومراحم والطاف نے ہم لوگوں کے زخمی دلوں کے لئے اعلیٰ ترین مرحم کا کام دیا کہ جن اعزازات سے اعلیٰ حضرت سرکار ناصر الملت اعلیٰ اللہ مقامہ کو یاد فرمایا کرتے تھے، ان سے ہم کو بھی محروم نہیں کیا، کہ ماہ محرم کے تبرکات اور جشن سالگرہ مبارک کے ہدایا وتحف شیرینی ارسال فرماکر امائل واقران میں سر افتخار کو بلند فرمایا۔

حق جل علا وجود مسعود کرامت نمود خسروانہ کو ابد الآباد مصدر فیض نامتناہی رکھے اور سحاب کرم جملہ متوسلین کے سروں پر عموماً اور ہم دعا گویان قدیم کے سروں پر خصوصاً برستار ہے، بحق محمد وآل الامجاد علیہم الاف اسلام الی یوم المیعاد۔

یہ بھی اقبال شاہانہ ہے کہ باوجود مشکلات وصعوبات کے جس طرح آباء واجداد کتب خانہ کی خدمت وحفاظت اپنے نفس پر مقدم رکھتے تھے، ہم بھی نقش قدم پر چلنے کی سعی کررہے ہیں۔ اب تک کتب خانہ کے تمام امور اسی طرح انجام پذیر ہورہے ہیں جس طرح سرکار ناصر الملت اعلیٰ اللہ مقامہ کے حیات میں انجام پاتے تھے، جس کا بین ثبوت ہز اکسلنسی کورنر صاحب بہادر، یوپی کا دہ مصایقہ ہے جو ۲۸ر اپریل کو بوقت تشریف آوری تحریر فرمایا تھا، جس

کا ایک عکس بغرض ملاحظہ ساطعہ حاضر خدمت ملوکانہ ہے۔

اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کے فیوض وبرکات ایسے لامتناہی ہیں جس کے احاطہ سے قلم عاجز اور بیان سے زبان قاصر ہے۔ ذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔ خداوند عالم ذات عالی صفات شاہ آصف جاہ خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ کو دائماً مورد افضال نامحدود رکھے۔ بحق صاحب مقام المحدود وآلہ الطاہرین اہل الکرم والجواد علیہم الالف السلام من الرب والودود۔

آخر معروضہ میں عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ عرصہ سے ہمارا دل چاہتا تھا کہ بارگاہ سلطانی میں معروضہ پیش کرکے اظہار عقیدت واخلاص کرتے۔ لیکن اس خوف سے ہمت نہ ہوئی کہ کہیں مشاغل شاہانہ میں ہارج ومانع نہ ہو۔ لیکن آج کی عید سعید آخر یعنی روز ولادت باسعادت ولی عصر مہدی دین حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ وسہل اللہ مخرجہ جعلنا من انصارہ واعوانہ، نے اس کی جرأت اور ہمت پیدا کردی، کہ یہ معروضہ بارگاہ خسروی میں پیش کرکے اظہار کمال اخلاص وعقیدت کریں اور اس عید سعید السعد کی مبارکباد معرض ملوکانہ میں پیش کریں۔ حق جل علا ہمیشہ ہمیشہ اعلیٰ حضرت کو زیر سایۂ عاطفت حضرت ولی عصر عجل اللہ ظہورہ، مسند جہانبانی واریکہ سلطانی پر متصدد ومتمکن رکھے اور تا ظہور حضرت حجت ہر سال یہ عید مبارک کرے۔ بحق محمد وآلہ الطاہرین، سلام اللہ علیہم اجمعین من یومنا ھذا الی یوم الدین۔"

اس خط کے جواب میں نظام نے چھوٹے سے کاغذ کے ٹکڑے پر اپنے ہاتھ سے لکھ کر اپنے دفتر کو یہ تاکید کی۔

"اس کا جواب دینا ہوگا۔ میرے نامہ کا خط دوسرے لفافے میں ڈال کر اس پر یہ لکھا جائے اور رجسٹری کی جائے احمد علی صاحب داروغہ کنگ کوٹھی پیلس، حیدرآباد دکن یہ یہاں یہ بھی بتلادیا جائے کہ اسی لفافے پر یہ چھپا ہوا تھا۔

H.E.H.The Nizam mili tany Secr tary Office King Kotti Palace.
Hydrabad Deccan.

آخر میں میں خانہ فرہنگ جمہوری اسلامی ایران دہلی خاص کر ڈاکٹر مہدی خواجہ پیری صاحب کا شکر گذار ہوں جنہوں نے ان خطوط کے مطالعہ کا موقع عنایت کیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ادیان ومسالک:

ایس ۔ ایم۔ حسین ، حیدرآباد

اسلام اور دیگر ادیان ومذاہب

(ایک تقابلی مطالعہ)

دین کی جمع ہے ادیان لغات القرآن میں دین کے معنی ہیں مذہب جس کی جمع ہے مذاہب ، اسلام اور دیگر ادیان کے تقابلی مطالعہ سے پہلے ایک پیمانہ یا معیار کا تعین ضروری ہے اور وہ معیار ہوگا اللہ کی پسند کیونکہ تمام مذاہب کے ماننے والے یقیناً صرف اپنے ہی مذہب کو حق اور بہتر کہیں گے تو آیئے ہم دیکھیں کہ اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ دین کونسا ہے؟ اور کیوں ہے؟

ایک مسلمان کے لئے جو اللہ اور اس کی کتاب پر یقین رکھتا ہے،قرآن کریم کے اس چھوٹے سے فقرے کی تلاوت کافی ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ان الدین عند اللہ الاسلام کہ دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے اس کا پسندیدہ ہے اس کا منتخب کیا ہوا ہے اس کے علاوہ کوئی شئے اللہ کے نزدیک دین نہیں ہے۔ لیکن آج کا نوجوان اور آنے والی نسلیں سائنس اور ٹکنالوجی کے عہد کی نسلیں ہیں۔ مذہب کو سمجھائے بغیر مذہب ان سے منوایا نہیں جاسکے گا۔ وہ زمانہ گذر چکا جب اندھی تقلید عقیدت کے غلاف میں لپیٹا ہوا مذہب ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثے میں ملتا تھا اور لوگ اس غلاف کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔ آنے والی نسلوں کو توہمات کے راستے مذہب کے دروازے تک نہیں لے جایا جاسکتا۔ ذرائع ابلاغ نے دنیا کو سمیٹ کر چھوٹا کردیا ہے دنیا بھر کی تہذیبیں ثقافتیں بلکہ خیالات ونظریات مخلوط ہوتے جارہے ہیں۔ انٹرنٹ کے اس عہد میں ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ نہیں رکھا جاسکتا

۔ جدید فکر کو صرف ''ہے'' کہہ کر مطمئن نہیں کیا جاسکتا ہے'' کیا ہے'' کیوں ہے'' اور'' کیسے ہے'' کے جواب دینے ہی پڑیں گے۔ اور جواب کے لئے عصری اسلوب اور سائنٹفک ذریعہ اظہار ضروری ہے۔ آج اگر کوئی یہ سوال کرے کہ ہمیں کیا حق ہے کہ صرف اسلام ہی کو اللہ کا پسندیدہ دین قرار دیں اور صرف اپنے مذہب کو صحیح اور دوسرے مذاہب کو غلط کہیں ۔ اس طرح تو ہر مذہب کے ماننے والے کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کو حق اور دوسرے کو باطل قرار دے۔ اور یہ استدلال بھی کیا جاسکتا ہے کہ کسی شئے کے بارے میں کوئی رائے دینے کا حق صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے بارے میں پوری طرح واقفیت حاصل ہو۔ اس وقت دنیا میں تقریباً ۱۶۰۰ مذاہب ہیں انہیں غلط یا صحیح قرار دینے کا حق اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب ہم ان مذاہب کی فلاسفی ، ان کے مراسم اور اس مذہب کی پیچیدہ نزاکتوں کا غیر جانبدارانہ اور تفصیلی مطالعہ کرلیں ۔یعنی ۱۶۰۰ مذاہب کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے کم سے کم ۱۶۰۰ سال کی حیات درکار ہے جو ناممکن ہے۔ یا پھر بلا تحقیق صرف آبائی مذہب پر قائم رہیں لیکن آباء واجداد کا مذہب جو بطور وراثت مل گیا ہے اس کے تعلق سے کیا ہم محسوس نہیں کرتے کہ یہ اپنا ذاتی مذہب نہیں ہے کیونکہ آدمی کا ذاتی مذہب وہی ہے جسے خود اس نے اپنی عقل وفہم کی روشنی میں ذاتی غور وفکر کے ذریعہ حاصل کیا ہو جسے وہ پوری طرح جانتا بھی ہو اور پہچانتا بھی ہو۔

ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ دینی شعور کی کمی اور اسلامی حقائق ومعارف سے ناواقفیت ہے جس کے حصول کا ذریعہ مذہبی لٹریچر ہے۔ مثل مشہور ہے کہ قومیں اپنے لٹریچر سے پہچانی جاتی ہیں لیکن المیہ یہ ہے کہ ہماری قوم خطابت میں سب سے آگے ہے مگر لٹریچر میں سب سے پیچھے ہے۔ ہمارے یہاں روز نئے خطیب تو ضرور پیدا ہورہے ہیں مگر قلم کی دنیا میں خموشی چھائی ہوئی ہے۔ کتنا عبرت کا مقام ہے کہ آج اگر کوئی ہم سے کہے کہ ہمیں کسی ایسی کتاب کا نام بتایئے جسے پڑھ کر ہم حضرت علیؓ کے کارناموں اور اس کی معنویت کو سمجھ سکیں تو ہم صبح

سے شام تک یہی سوچتے رہ جائیں گے کہ کس کتاب کا نام لیا جائے ؟ یہ تنقید نہیں بلکہ حقیقت ہے (استثناء کے ساتھ) کہ ہماری مذہبی معلومات کا ذریعہ صرف تقاریر ہیں وہ بھی ان کی تقاریر جو تقاریر سن کر مقرر بن گئے اس لئے آج تقاضائے ممبر اور احترام ممبر ایک سوال بن کر ابھر رہا ہے۔

ان سارے مسائل کے باوجود نہ صرف دیگر ادیان کے ماننے والوں کے لئے بلکہ خود ایک مسلمان کے لئے یقین محکم کی منزل کو حاصل کرنے سے زیادہ اس سوال کا جواب تلاش کرنا ضروری ہے کہ سارے ادیان میں صرف اسلام ہی کیوں اللہ کا پسندیدہ دین قرار پایا۔ قرآنی دلائل صرف مذہب اسلام کے ماننے ہی والوں کو دئے جاسکتے ہیں ۔ باقی ۱۵۹۹ ادیان کے لئے یہ دلائل کتنے قابل قبول ہوسکتے ہیں جو قرآن پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ میں اپنی کم علمی کے اعتراض کے بعد عقل وشعور کی روشنی میں سائنٹفک اسلوب کے ذریعہ اس سوال کا جواب پیش کرنے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ لفظ دین جو سارے مذاہب میں مشترکہ لفظ ہے اس سے کیا مراد ہے۔ کافی غور وفکر اور ممکنہ ذرائع سے استفادہ کرنے کے بعد ایک بات واضح ہوئی کہ سارے ادیان میں نہ صرف لفظ دین مشترک ہے بلکہ اس کا مفہوم بھی ایک ہے جس کا انسانی زندگی سے گہرا ربط ہے۔ میری کمزور پرواز فکر نے لفظ دین کا جو مفہوم اخذ کیا ہے وہ بغرض تصحیح آپ کے سامنے پیش ہے کہ انسان اپنی بقاء کے لئے اپنی فطرت اپنے شعور اپنے فہم وادراک کی قوتوں کو کام میں لاتے ہوئے چند چیزوں کو پسند کرتا ہے اور استعمال میں لاتا ہے اور چند چیزوں کو ناپسند کرتا ہے اور استعمال میں نہیں لاتا۔ اس پسندیدگی یا ناپسندیدگی کا تعین ایک نظام کے تحت ہوتا ہے اس نظام کا نام ہے دین ۔ یا یوں وضاحت کروں کہ بنیادی طور پر حیات انسانی ایک تنظیم سے وابستہ رہتی ہے انسان کسی نہ کسی شئے کو اختیار کریگا اور کسی نہ کسی شئے کو ترک کریگا نہ ہر چیز اختیار کریگا نہ ہر چیز کو ترک کرے گا یہ اختیار وترک کرنے کا عمل ایک تنظیم کے تحت ہوتا ہے ۔ بقاء کے لئے

تنظیم ضروری ہے اور تنظیم کے لئے ضابطہ ناگزیر ہے اور اسی ضابطہ حیات کا نام دین ہے ۔ واضح رہے کہ یہ تجزیہ صرف اسلام یا مسلمانوں کو پیش نظر رکھ کر نہیں بلکہ سارے انسانوں کی فطرت وشعور اور ان کے فہم وادراک کی کوششوں کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے ہم ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں کہ اب اگر انسان اپنی بقاء کے لئے کسی چیز کو منتخب کرتا ہے تو یہ انتخاب انحصار کرتا ہے اس ضرورت پر جو اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسا نظام ہو جو انسان کی ساری ضرورتوں اور تقاضوں کا لحاظ رکھے تو سب سے پہلے ضرورتوں اور تقاضوں سے آگاہی لازم ہے انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہے جسم ، نفس اور روح ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان تینوں اجزاء کے تقاضے کیا ہیں۔ ظاہر ہے کہ جسم کے تقاضے نفس سے اور نفس کے تقاضے روح سے مختلف ہوں گے کیونکہ جسم ایک مادی شئے ہے اور نفس غیر مادی جو عقل وادراک کا سرچشمہ ہے اور روح موت وحیات کا مرکز اب ان کے تقاضے بھی باعتبار نوعیت مختلف ہوں گے یعنی جسم ان چیزوں کا طالب ہوگا جو اس کی بقا کے لئے مفید ہوں نفس ان ادراک کا تقاضہ کرے گا جو اس کی تسکین کا باعث ہو اور روح ان اقدار اور مفاہیم کی طلب گار ہوگی جنہیں مقصد زندگی بنایا جائے ۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ مادی شئے کی تسکین مادی شئے سے ہوگی روحانی شئے کی تسکین روحانی شئے سے ہوگی اس لئے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اچھی غذا عمدہ لباس بہترین مکان نفس کو تسکین پہنچا سکتے ہیں۔ اور نہ یہی کہا جاسکتا کہ اعلیٰ علوم اور ادارک جسم کو مطمئن کرسکتے ہیں ۔ عالم انسانیت محتاج ہے ایک ایسے نظام کی جو اس کے تینوں اجزاء کی ضرورتوں کا لحاظ رکھے۔ مکمل نظام صرف وہی ہوگا جو جسم کی بقاء نفس کی تسکین اور روح کی فرحت کا خیال رکھے۔ لیکن دنیا میں دو قسم کے نظام پائے جاتے ہیں ایک وہ نظام جس نے اپنا رشتہ صرف روحانیت سے جوڑ رکھا ہے جیسے یہودیت ، عیسائیت ، ہندو ازم بدھ ازم وغیرہ جن کی کتابوں میں روحانیت کا فلسفہ تو نمایاں طور پر نظر آتا ہے لیکن سماجی اور اقتصادی مسائل کو حل کرنے کے واضح وقطعی طریقے بیان نہیں کئے گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان ادیان میں جسم کو فنا کرنا ، لباس سے عاری ہونا ،

آبادیوں کو ترک کر کے جنگلوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چلے جانا اسی کو کمال انسانیت سمجھا گیا۔ دوسرے نظام میں صرف مادیت پر توجہ دی گئی ان کا عقیدہ وایمان کسی ماورائے مادہ طاقت پر نہیں ہے۔ جیسے اشتراکیت ، اشتمالیت سرمایہ داری وغیرہ اس نظام میں تمام تر زور روٹی کپڑا اور مکان کے مسائل پر دیا گیا روحانی افکار اخلاقی اقدار کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اشتراکیت میں پوری حیات انسانی اور تاریخ بشریت کو صرف اقتصادیات کے محور پر گردش دی گئی ہے۔ تو اب ہمارا تجزیہ یہ رہا ہے کہ سارے ادیان میں کچھ دین مادیت سے متعلق رہے تو تو روحانیت سے واسطہ نہ رکھا اور کچھ دین روحانیت سے متعلق رہے تو مادی تقاضوں کو زبردستی نظر انداز کر دیا۔ جبکہ حیات انسانی کے لئے مکمل نظام کی تلاش ہے جو جسم کی بقاء نفس کی تسکین اور روح کی فرحت کا باعث ہے۔

اس منزل پر مکمل نظام کی تلاش سے قبل ایک انتہائی اہم پہلو پر بھی غور کرنا ضروری ہے کہ حیات انسانی کے نظام کو دو طاقتوں نے متعارف کرایا ہے۔ ایک نظام کو انسان یعنی مخلوق نے ترتیب دیا اور ایک نظام حیات کا تعارف اللہ یعنی خالق نے دیا۔ انسانی طاقت جس نے اپنے شعور، اپنے مشاہدے، اپنے علم اور اپنی معلومات کو بروئے کار لاتے ہوئے جو نظام مرتب کیا اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کئی نقائص ابھر کر سامنے آتے رہے۔ پہلے تو انسان کے مرتب نظام جغرافیائی حدود میں کارآمد رہے۔ دوسرے بار بار تبدیلی وترمیم کی ضرورت پڑتی رہی تیسرے عالم انسانیت کی مکمل ضروریات سے لاعلمی جامع نظام کو مرتب کرنے میں مانع رہی۔ جس کی چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں کہ کس طرح انسانوں کو زمین پر آزادی وبے فکری سے زندگی بسر کرنے کے لئے بڑے بڑے مفکرین وفلسفیوں نے عجیب عجیب نظریے اور راستے دکھائے جو منزل تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو گئے۔

یونانی مفکر اپکوریس (EPICURUS) نے کہا کہ ”خداؤں کا وجود ہے لیکن وہ انسانی مسائل سے بے نیاز ہو کر خود آسمانوں میں تفریح کرتے رہے ہیں چنانچہ انسانوں کو بھی

عمل کی آزادی ملی ہے وہ بھی کھائیں پئیں مزہ کریں یہ اپکوریس فلاسفی کا بنیادی اصول تھا۔ اس نے تو خیر خدا کا ذکر کردیا تھا اس کے بعد کے دور میں تو مشہور فلسفی نطشے (Neitzche) نے کہدیا کہ معاذ اللہ خدا جنت میں مر چکا ہے اور اب دنیا آزاد ہے خدا کی موت کے اس اعلان نے ذہنوں پر جو اثر چھوڑا اسکی ایک مثال مشہور و قابل عالم مذہبیات ودینیات جرمن مصنف ڈاکٹر فاسٹس (Dr.Fastus) جو دنیاوعیش وعشرت کی خاطر شیطان سے اپنی روح کا سودا کرلیتا ہے اور دنیا کی لذتوں کے حصول کے بعد مقررمدت پر جب اس کی روح قبض ہونے کا وقت آتا ہے تو وہ اپنی روح کو شیطانی طاقت سے نجات کے لئے جو فریاد وآہ وزاری کرتا ہے اس کا اثر کچھ عرصے تک ارباب علم وفکر پر رہا لیکن بعد میں مغرب نے اسے فراموش کردیا۔ موجودہ دور کے انسانی اذہان کو متاثر کرنے والی شخصیت مشہور ماہر نفسیات میگڈوگل (Mac Dougall) ہے جس نے انسانی اعمال وافعال کا ذمہ دار اس کی جبلتوں کو ٹھہرایا۔ اور ارادہ وعقل کی قوت کو بھی انسانی جبلتوں کے زیر اثر کردیا جس کی وجہ سے اخلاقی قدروں کا فقدان ہوا۔ فرائڈ (Faraed) نے تو اخلاقی قدروں کی عظمت ختم کرنے میں کوئی کسر نہ رکھی۔ اس نے کہہ دیا کہ انسان اپنے جنسی جذبات کی تسلی وتسکین ہی کے لئے سب کچھ کرتا ہے۔ اخلاق، مذہب، آرٹ فن علم وفکر سب جنسی جذبے کی آسودگی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ذہن وفکر کو راہ حق سے ہٹانے میں کارل مارکس (Carl Marx) کی تعلیمات کا بھی بڑا اثر ہے۔ مارکس نظریہ مذہب کو ایک افیون قرار دیتا ہے۔ جو انسان کو بے حس و بے عمل بنادیتی ہے اور اسے ترقی کی راہوں پر بڑھنے سے روکتی ہے۔ مارکسی تعلیم کا ایک اہم نعرہ یہ بھی ہے کہ ''خدا کو جنت سے اور امارت کو زمین سے نکال دو'' اسی مادی تصور حیات کی ترجمانی کرتے ہوئے مارکس نے اپنا فلسفہ حیات پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''وسائل معاش کی ترقی ہی وہ چیز ہے جو لوگوں کے باہمی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے کیونکہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ وسائل پیداوار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ دراصل وہ انسانیت کو ترقی یافتہ حیوانیت ہی کی تعبیر دے رہا تھا۔

اس کی موجودہ مثال ہمارے پیش نظر ہے کہ ایک بڑی طاقت خود کو ترقی یافتہ مہذب امن کی علمبردار ظاہر کرتے ہوئے جدید اسلحہ سے لیس ہوکر انسانی لاشوں کو کچلتے ہوئے خون کے دریاؤں میں تیرتے ہوئے اپنے مقام سے میلوں دور مختلف بہانوں سے دوسروں کے وسائل پیداوار پر پٹرول کے ذخائر پر تصرف کرنا چاہتی ہے۔ اشتراکیت کے زوال پر آیت اللہ سید روح اللہ خمینیؒ فرماتے ہیں کہ کمیونزم کی شکست ایک فطری امر ہے کیوں کہ کمیونزم انسان کو ایک مشینی وسیلہ میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جب کہ انسان کی فطرت کچھ اور ہے۔ خداوند عالم نے اسے آزاد خلق کیا ہے اور کمیونزم انسان سے اس کے اختیارات کو سلب کرلیتا ہے بالخصوص فکری اعتبار سے۔ جب انسانی افکار کے مرتب نظام حیات ایک مقام تک پہنچ کر بکھر گئے تب ایک سچے مذہب کی ضرورت محسوس کی گئی۔

لندن کا اخبار ٹائمز اپنے اداریہ میں لکھتا ہے کہ ”اقتصادی خوشحالی کی تدابیر سے اشتراکیت کا مقابلہ کرنا جو مارشل ایڈ پلان کا خاص مقصد تھا کبھی کامیاب نہ ہوگا۔ آگے لکھتا ہے کہ اشتراکیت کے مذہب اور اس کی جاذبیت کا کامیاب مقابلہ کرنے کے لئے جس سے اس وقت ہر ایک جمہوریت پرست گروہ عاجز ہے اس گہری حقیقت پر غور کرنا چاہئے کہ آخر کار ایک سچا مذہب ہی ہے جو ایک جھوٹے مذہب کے ساتھ مقابلہ کرکے اسے فنا کرسکتا ہے دنیا کے مشہور مفکر وفلاسفہ اور دیگر ادیان کے نظام حیات پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد اب اس دوسرے نظام حیات پر غور کریں جسے خالق نے متعارف کرایا ہے۔ ان اصولوں پر نظر ڈالیں جنہیں اللہ نے، خالق نے بنائے ہیں۔ جو اسلام میں ہیں دوسرے ادیان میں نہیں ہیں۔ دنیا سے تمام برائیوں کو نکال پھینکنے کے لئے صرف ایک ہی سچا مذہب ہے جس کا نظام حیات اپنے دامن میں زندگی کے سارے مسائل کا حل سمیٹے ہوئے ہے وہ ہے اسلام جو امن وسلامتی کا پیامبر ہے۔ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو ایک مکمل نظام حیات پیش کرتا ہے جو انسان کے تینوں اجزاء جسم نفس اور روح کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اسلام ہی وہ واحد نظام زندگی پیش

کرتا ہے جس میں فرد کے صحیح مقام کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کو سماجی ذمہ داریوں کا بھی حامل قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام میں زندگی کا ایک روحانی تصور بھی موجود ہے۔ جس میں اخلاقی اقدار کی روح کارفرما ہے۔ اشتراکیت کی طرح اسلام معاش کو انسانی زندگی کا محور تسلیم نہیں کرتا بلکہ اس کے بجائے وہ خدا کی خوشنودی و آخرت کی فلاح کو انسانی زندگی کا مرکز قرار دیتا ہے۔ اسلام انسانوں کو حقائق سے گریز کرنا نہیں سکھاتا بلکہ ان کا مقابلہ کرنا سکھاتا ہے۔ اسلام انسانوں کو رہبانیت اور ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جس کے معنی ہیں نظام بندگی یا نظام اطاعت جس کا نصب العین مخلوق کو خالق کی مرضی پر چلانا ہے تاکہ انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کی بخشی ہوئی تمام قوتوں سے صحیح طور پر کام لے اور اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں کو صحیح طور پر استعمال کرے اور پھر اس طرح حیات دنیوی کو حیات اخروی سے وابستہ کرسکے۔ اسلام مادہ و روح دنیا و آخرت کی تفریق نہیں کرتا اور نہ ان کو مختلف خانوں میں تقسیم کرتا ہے بلکہ ان سب کو ہم آہنگ کرتا ہے اور اسی سے زندگی کا صحیح شعور بیدار کرتا ہے یہ مادی ضرورتوں کا قائل ہے اور اس کی اہمیت کا احساس بھی کرتا ہے اور سرمایہ سے بھی نفرت کرنا نہیں سکھاتا لیکن تزکیہ نفس کو ان پر مقدم رکھتا ہے۔ تزکیہ نفس سے ترک دنیا مراد نہیں ہے بلکہ انسانیت کا ارتقاء مراد ہے جو اللہ کے بنائے قوانین کی روشنی میں حاصل ہوتا ہے۔ اب میں قرآن کے حوالے سے انسانی فلاح کا معیار پیش کروں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ قد افلح من تزکیٰ وقد خاب من دساھا۔'' اس شخص نے فلاح پائی جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کرلیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کو دبا دیا۔ اس تصور حیات کے مطابق زندگی کے سارے مسائل میں انسان کا بنیادی مسئلہ پہلے اپنے نفس کا تزکیہ کرنا قرار پاتا ہے۔ روٹی اور پیٹ کے مسئلہ کو اسلام اس کا جائز مقام دیتا ہے۔ کلوا وشربوا ولاتسرفوا۔ کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اسلام نے سرمایے کی مذمت تو نہ کی لیکن اس کے حصول کے ایسے حلال ذرائع

بتائے جن سے اخلاقی اقدار و نصب العین کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ اور انسان کے فطری احساسات اور اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے عدل و احسان اور ایثار کے ساتھ اکتساب سرمایہ کی ہدایت دی۔ جہاں حلال طریقوں سے دولت حاصل کرنے کی اجازت دی وہیں حقوق بھی عائد کر دیئے۔ اسلام میں معاشرے کے اہل ثروت پر بہت ذمہ داریوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ انہیں اپنی عقبیٰ کی زندگی کا تصور بھی رہتا ہے۔ انہیں بتایا گیا کہ قبر میں سو جانا سفر کا اختتام نہیں ہے قبر تو ایک منزل ہے جہاں حیات انسانی کا کارواں رک کر پھر دوسری دنیا کے سفر کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ اسی لئے زکوٰۃ اور صدقہ کو سفر آخرت کا زاد راہ قرار دیا گیا۔ اور اس طرح تزکیہ نفس وتزکیہ مال کی طرف متوجہ کیا۔ اسلام کے نظام اخلاق میں اور بھی ایسی تعلیمات ہیں جس میں حاجتمندوں قرابتداروں، یتیموں اور مسکینوں کی مدد کی طرف متوجہ کیا گیا یہاں تک کہ پڑوسی کا بھی حق بتایا گیا۔ تہذیب الاسلام میں بیت الخلاء کے آداب سے لیکر مباشرت کے احکام تک بتائے گئے۔ غرض زندگی کے ہر شعبے کے لئے ہدایات موجود ہیں ان تعلیمات پر جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعلق ہیں۔ اگر دنیا انہیں اپنا لے تو انسانیت کی اصلاح کے لئے اس سے بہتر ہدایت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ انسان اپنی زندگی کو اسلام کے نظام اخلاق کے تحت سنوارے۔ یہ ہماری گرتی ہوئی انسانیت جسے انسانوں نے خود سولی پر چڑھا رکھا ہے اور جس کی روح پر کوڑے برسائے جا رہے ہیں اسلام ہی کے بتائے ہوئے اصولوں پر چل کر نجات پا سکتی ہے اس تقابلی جائزہ کے بعد اسلام کو تمام ادیان میں اللہ کا پسندیدہ دین قرار دینے میں تردد اور کیوں کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔

☆☆☆☆

پروفیسر سید جعفر رضا

اسلامی فرقے

مختلف مسالک اہل سنت کا اجمالی تعارف

حنفی مسلک:

اس مسلک کے بانی امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی (م: ۱۵۰ھ، ۷۶۷ء) اہل تسنن میں امام الاعظم کے نام سے معروف ہیں، جو شیعی فقہ کے تربیت یافتہ اور امام جعفر صادق کے شاگردوں میں سے تھے اور اپنے فتاویٰ میں ائمہ اہل بیت سے استناد کرتے۔ عرصے تک کلامی جھگڑوں میں الجھے رہے جس کا اکھاڑہ بصرہ تھا، پھر ان سے بیزار ہو کر فقہ کی طرف متوجہ ہوئے، جس کے دو مراکز تھے بصرہ اور کوفہ۔ امام ابوحنیفہ بصرہ کے اہل حدیث میں شامل نہ ہوئے۔ کوفی دبستان اختیار کیا، جس کی ابتدا حضرت علی سے ہوئی تھی۔ لیکن بعد کے ادوار میں بعض مخصوص افکار وعقاید اختیار کر لینے کی بنا پر اہل الرائے، کا مرکز بن گئے۔ اس مدرسہ کے فارغین جامور اساتذہ میں عبد اللہ بن مسعود (م: ۳۲ھ، ۶۵۲ء) شریح (م: ۸۱ھ/ ۶۹۷ء) علقمہ (م: ۱۹۹ھ/ ۸۱۴ء) مسروق (م: ۶۳ھ/ ۶۸۲ء) ابراہیمی نخعی (م: ۹۶ھ/ ۶۱۴ء) اور حماد (م: ۱۱۹ھ/ ۷۳۷ء) انہیں حماد کی خدمت میں ابوحنیفہ اٹھارہ برس رہے، ان کے جانشین ہوئے اور تقریباً ۳۰ سال تک صدر نشین رہے۔ اس درمیان ہزاروں مسائل کے جوابات دیے جن کو شاگردوں نے ملفوظات کی صورت میں قلم بند کر دیا۔ [۲] فقہ حنفی اور فقہ جعفری کے درمیان زبردست مماثلتیں برقرار ہیں، جس سے دونوں کے ایک ہی ماخذ سے مبنی ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔

امام ابو حنیفہ کا ایک اہم کارنامہ غیر سرکاری مجلس وضع قانون (Private

(Legislature) کی تشکیل تھی ، جو کسی طرح کے سیاسی قوت نفاذ (Authority of Political Sanctions) کے بغیر اپنی خوبی ، صلاحیت اور مطابقت احوال اور مدونین کے ذاتی اخلاقی ومذہبی اثرات کی بناپر سلطنتیں خود انہیں نافذ کرنے پر مجبور ہوئیں۔ اس مجلس کے شرکاء امام ابوحنیفہ کے نامور شاگرد تھے جو اپنے دور کے فاضلین میں شمار ہوتے تھے۔ ان میں قاضی ابویوسف، محمد بن حسن الشیبانی (م: ۱۹۰ھ/ ۸۰۵ء)عبد اللہ بن مبارک ، ابو عبد اللہ وغیرہ مشہور ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا طریقہ کار تھا کہ اپنی رائے بعد میں پڑھواکر سنتے تھے۔ ابو عبد اللہ کا بیان ہے: "میں امام کے اقوال ان کو پڑھ کر سناتا تھا۔ ابو یوسف کی عادت تھی کہ امام کے اقوال درج کرتے ہوئے ، اپنے طور پر اضافہ کردیا کرتے تھے۔ اس لیے پڑھتے وقت میں کوشش کرتا تھا کہ ان کے اضافے چھوڑتا جاؤں اور صرف امام کے اپنے اقوال سناؤں۔ ایک روز میں چوک گیا اور دوسرا قول بھی پڑھ دیا۔ امام نے پوچھا یہ دوسرا قول کس کا ہے؟ "[4]
امام ابوحنیفہ کے فقہی مباحث میں ان کا اصول قیاس انفرادیت کا سبب بنالیکن اس پر شدید اختلافات ہوئے، جو اہل تسنن کے مختلف مسالک کے وجود میں لانے میں معاون ہوئے۔ یہ اصول قیاس قرآن الحکیم کے مکتوبی الفاظ یا مسائل میں لفظی موافقت تک محدود نہیں ہے بلکہ الفاظ کے پردے میں قرآنی احکام کی علت یا سبب جاننے پر زور دیتا ہے جس میں فروعی احکامات میں قرآن و حدیث کی علت تلاش کی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن نے خمر کو نشہ کی بناپر حرام قرار دیا تو ایسی تمام چیزیں حرام قرار پائیں جن میں نشہ ہو۔ یا قرآن نے چوری کی سزا قطع ید قرار دیا تو چوری میں نقب زنی بھی شامل ہے، اس لیے نقب زنی پر قطع ید کا حکم ہوگا۔ قیاس میں سب سے بڑی مصیبت مغالطہ بازی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی مثال امام ابوحنیفہ کے عزیز ترین شاگرد امام ابو یوسف تھے، جو قانون شریعت کو مختلف مصالح کے پیش نظر توڑنے مروڑنے کے ماہر تھے۔ ابن خلکان الشافعی (م: ۶۶۲ھ/ ۱۲۶۴ء) نے علامہ ابی جعفر الطبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ابو یوسف کی وضع کردہ احادیث کو ثقہ محدثین شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے

کیونکہ موصوف رائے کے ذریعہ نت نئے قوانین اخذ کرتے تھے۔[۴] انھوں نے مقامی رسم ورواج کو اسلامی عقاید کا جز وبنایا اس کا اصطلاحی نام استحسان رکھا، جس کی بنیاد پر وہ ہر طرح کے مفید مطلب قوانین وضع کرتے تھے۔[۵]

مالکی مسلک:

اس مسلک کے بانی ابو عبد اللہ امام مالک بن انس اصبحی (م: ۱۷۹ھ/ ۷۹۵ء) امام جعفر صادق اور امام ابوحنیفہ دونوں کے شاگرد تھے۔ حالانکہ امام ابوحنیفہ اور ان کے فقہی طریقہ کار میں اصولی طور پر اختلاف نہ تھا لیکن جزئیات وتفصیلات میں شدید اختلافات تھے۔ انہوں نے مدینہ منورہ کو فقہی مرکز بنایا اور قرآن وسنت کے بعد مدینہ کے رسم ورواج کو اساسی درجہ عطا کیا۔ اگر احادیث کے احکام میں اختلاف ہوتو مالکی مسلک کے مطابق اہل مدینہ کے رسم ورواج کو قبول کرنا چاہئے۔ اگر حدیث اور رسم ورواج اہل مدینہ سے مدد نہ مل سکے تو مشتبہ احادیث کو قبول کرتے۔[۶] ان کا طریقہ کار قیاس کے حق میں نہ تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آزادانہ اور سن مانی رائے اور قیاس کی مخالفت میں مسلک مالکی وجود میں آیا۔[۷] امام مالک کے طریقہ فکر کی بہترین مثالیں 'موطا' سے پیش کی جاسکتی ہیں جس میں انہوں نے قانونی نظائر کے طور پر مختلف عنوانات کے تحت اولاً قرآنی آیات درج کیے، پھر احادیث اور آخر میں اہل مدینہ کے رسم ورواج۔ اگر قرآنی احکام واضح ہوتے تو احادیث ترک کردیتے۔[۸]

قانون اسلام میں اہل مدینہ کی قدیم رسم ورواج کو اسناد کا درجہ ماننے کی بنا پر بہت ساری ایسی روایات اسلام میں داخل ہوگئیں جو اہل عرب میں زمانہ جاہلیت سے رائج تھیں۔ مثلاً زمانہ جاہلیت میں قاعدہ تھا کہ نئے کنویں کے پانی کی آمدنی کا دسواں حصہ (عشر) دینا پڑتا تھا، یہ محصول اسلام میں بھی جاری رہا۔ یا ہبۂ عمری کا معاملہ، حالانکہ مشروط ہبہ کے خلاف متعدد حدیثیں موجود ہیں لیکن اہل مدینہ کے قدیم رواج کی بنیاد پر امام مالک جائز قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح موطا میں درج ہے کہ کوئی عجمی (غیر عرب) کسی عرب کا وارث نہیں ہوسکتا

لیکن اگر بچہ کی ولادت عرب میں ہوئی ہو تو اپنی ماں کا وارث ہوسکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ اس طرح کے عقائد تمام دیگر مسالک میں قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ ۹

شافعی مسلک:

اس مسلک کے بانی امام محمد بن ادریس شافعی (م: ۲۰۴ھ/ ۸۱۹ء) نے فقہ مالکی کی تعلیم براہ راست امام مالک سے اور فقہ حنفی کی تعلیم امام ابوحنیفہ کے شاگرد اور رفیق کار محمد بن حسن الشیبانی سے حاصل کی تھی۔ ان دونوں مسالک کا گہرا مطالعہ نا آسودگی کی صورت میں نمایاں ہوا، جو کہ ایک نئے مسلک کی تاسیس کا سبب ہوا۔ مسلک مالک سے ان کو شکایت تھی کہ اس میں حالات کو نظر انداز کر کے سنت کی لفظی پیروی پر زور تھا۔ مزید یہ کہ مالکی سنت نبوی اور اہل مدینہ کے رسم ورواج میں فرق نہ کرتے۔ مسلک حنفی سے ان کا اختلاف رائے ان کے آزادانہ استعمال کی بنا پر تھا۔ وہ فقہاء کے انفرادی آراء کے خلاف تھے۔ انھوں نے شدت سے محسوس کیا کہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں پہنچتے پہنچتے احادیث کو قرآن کے ہم پلہ ماخذ کی حیثیت حاصل ہوگئی، جس سے منطقی نتیجہ نکلا کہ حسب دل خواہ قرآنی احکامات منسوخ کیے جانے لگے کیونکہ مملکت اسلامی کے حدود کی توسیع کے بعد مختلف النوع رسم ورواج مسلمانوں میں نظر آئے۔ جن میں بعض رسم ورواج قرآن واحادیث کے احکامات کے برعکس ومتضاد تھے لیکن ان کی جڑیں سماج میں اتنی گہری تھیں کہ انھیں اکھاڑ پھینکنا آسان نہ تھا۔ یہ دشوار مرحلہ امام محمد الشافعی کے ہاتھوں سرانجام پایا۔ انھوں نے فقہ اسلامی کا ایک ایسا قاعدہ مرتب کرنے کو شش کی، جس میں گذشتہ مسالک کی خامیاں نہ ہوں۔ ۱۰

امام شافعی نے اصول قانون سازی اور ماخذ قانون کے متعلق سوچا سمجھا طریقہ کار اختیار کیا۔ انھوں نے قدیم علاقائی رسم ورواج کو باقاعدہ ماخذ کا درجہ دیا لیکن اس کے لیے اجماع ضروری قرار دیا۔ امام مالک بھی اجماع کے قائل تھے۔ لیکن ان کا اجماع علمائے مدینہ تک محدود تھا۔ امام شافعی نے اجماع کے دائرہ کو بے حد وسیع کر دیا، جس میں احادیث رسول

کے علاوہ ثقہ علماء کے خیالات بھی شامل کر دیے۔ یہ اصول بعد کے دور میں مزید مقبول ہوا، کیونکہ اس کے ذریعہ مسلمانوں کے ہنگامی مسائل کے حل تلاش کیے جانے لگے۔ مکہ و مدینہ کے مقدس شہروں کے علماء کے علاوہ ہر دور کے ہر علاقہ کے ثقہ علماء و فقہاء کی اجتماعی رائے کو اجماع قرار دیا جانے لگا۔ اس طرح امام شافعی نے قانون شریعہ کے ماخذ میں قرآن، سنت اور اجماع کے اصولوں پر برقرار رکھتے ہوئے قیاس کی صرف اس صورت میں اجازت دی کہ ان تینوں معتبر ترین ماخذ سے قانونی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو۔[۱۱] مسلک شافعی کے پیرو شمالی افریقہ، مصر، جنوبی عرب ملایا شری لنکا کے علاوہ ہندوستان میں بھی ملتے ہیں۔ ممبئی کے بعض بوہرے شافعی عقیدہ کے پیرو ہیں۔

حنبلی مسلک:

اس مسلک کے بانی امام احمد بن حنبل (م: ۲۴۱ھ/ ۸۵۵) کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ انہوں نے عباسی خلافت کے اہم دور (۴۲-۸۰۹) یعنی دور مامون و معتصم باللہ میں معتزلی عقاید کے سیلاب میں اہل تسنن کے عقاید و افکار کو قایم کرنے کی کوشش کی۔ ورنہ خلفائے وقت کی کوشش تھی کہ فرقہ اہل تسنن کی سرکاری حیثیت کو ختم کر کے اعتدال کو سرکاری مذہب بنادیا جائے۔ امام حنبل نے کوئی نیا فقہی مسلک رائج نہیں کیا، اس لیے معروف اسلامی مفسر، فقیہ اور مورخ علامہ جریر الطبری امام حنبل کو فقیہ نہیں مانتے، صرف محدث قرار دیتے ہیں،[۱۲] لیکن امام حنبل کی تشریح احادیث میں قانونی نکات کے وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حتی کہ گیارہویں صدی ہجری میں حنبلیوں کو سیاسی طاقت حاصل ہوگئی تو اہل تسنن میں اجماع ہوگیا کہ حنبلی مسلک بھی اہل سنت والجماعت کے راسخ العقیدہ مسالک میں سے ہے۔

امام حنبل اپنے استاد امام شافعی کے اصول قیاس کے سخت مخالفوں میں تھے۔ ان کے نزدیک قرآن اور سنت کی عقلی تشریح جائز تھی لیکن کسی مسئلہ کو محض اجماع کی بنا پر قبول نہ کرتے تھے بلکہ اس کو ناجائز و بدعت قرار دیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلک حنبلی اہل تسنن کے

دیگر مسالک کے مقابلہ میں زیادہ رجعت پسند اور انتہا پسند ہے۔ اس لیے اس کے پیروؤں کی تعداد وقت کے ساتھ گھٹتی گئی لیکن اٹھارویں صدی میں وہابی تحریک نے حنبلی مسلک کو دوبارہ سیاسی طاقت عطا کردی ورنہ یہ مسلک تاریخ کا ورق پارینہ بن کر رہ گیا ہوتا۔ ۱۳ حنبلی مسلک ہندوستان کے بعض علاقوں میں بھی مروج ہے۔

اہل تسنن کے ان چاروں مسالک کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو مجموعی اعتبار سے حنفی مسلک کے پیرو ابتدا سے زیادہ وسیع النظر رہے ہیں، ان کے مقابلہ میں مالکی اور شافعی مسالک میں زیادہ شدت رہی ہے۔ حنبلی عقاید وافکار میں انتہا پسندی میں کسی اور مسلک کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ حنفی خاص طور پر نشانہ بنے، جن کو 'اہل الرائے والقیاس' کا لقب ملا۔ حنبلی مسلک مذکورہ بالا دیگر تینوں فقہی مسالک سے زیادہ اہل الحدیث سے ہم آہنگ رہا۔ بعد کے ادوار میں خلافت ملوکیت میں پوری طرح ڈھل گئی تو شرعی پابندیوں کی پروا باقی نہ رہی۔ مسلمانوں کے آداب ومراسم میں انانیت پیدا ہوئی۔ تفریق پسندی نے ترقی کی تمام راہیں مسدود کردیں۔ اجتہاد کے دروازے بند ہوگئے۔ نادانستہ ہی سہی، اختلاف کے امکانات پر روک لگی۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی میں وہابیت کی تحریک نے دوبارہ اہل الحدیث کے نظریات کی بازیافت کردی اور اہل تسنن کے اساسی عقاید وافکار کو عصر نو نے جدید زاویہ نظر سے دیکھا۔

مسلک اہل حدیث:

گذشتہ صفحات میں ذکر آچکا ہے کہ اہل تسنن کے فقہی مسالک میں امام ابو حنیفہ اور ان کے پیروؤں کو اہل الرائے، قرار دے کر الگ کر دیا جاتا رہا۔ باقی تینوں مسالک مالکی، شافعی، اور حنبلی اہل الحدیث میں شمار ہوتے تھے، جن کے رہنما امام مالک تھے۔ ان کی توجہ حدیث پر زیادہ تھی۔ قیاس اور رائے کو دخل نہ دیتے۔ مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، بصرہ، یمن شام وغیرہ اہل الحدیث کے اہم مراکز تھے۔ علم الحدیث کا ذکر اہل تسنن کے ایک مسلک کی حد تک کیا جائے گا جو ابن تیمیہ (م: ۷۲۸ھ، ۱۳۲۷) کو امام الحدیث قرار دیتا ہے اس مسلک کا

عقیدہ ہے کل حدیث لایعرفه ابن تمیمیه فلیس بحدیث (جس کو ابن تیمیہ نہ جانتے ہوں، وہ حدیث نہیں ہے۔ ۱۴؎ انھوں نے امام غزالی (م: ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) کے نظریہ تقلید جامد کے خلاف آواز اٹھائی اور قرون اولیٰ کے مجتہدین کی طرح اجتہاد کرکے احادیث اور آثار صحابہ سے استنباط کیا۔ مذکورہ بالا چاروں مسالک نے اہل تسنن کے درمیان آزادانہ محاکمہ کیا اور کثیر التعداد مسائل کے ان سے مختلف حل تلاش کیے۔ اسی مسلک کے شیخ عبد الوہاب علی شاذلی سے مکہ مکرمہ میں تین سال تک تعلیم وتربیت حاصل کرکے شیخ عبد الحق محدث دہلوی (۵۰ء/۱۶۴۰ء) نے ہندوستان میں مسلک اہل الحدیث کو قائم کیا۔ ۱۵؎ حالانکہ موصوف اولین ہندوستانی محدث نہ تھے۔ ان سے قبل دور قطب الدین ایبک (۱۲۰۶ء) میں امام حسن بن محمد صنعانی علم حدیث کی روشنی ہندوستان میں پھیلا چکے تھے، جن کی کتاب مشارق الانوار مشہور ہے لیکن محدث دہلوی کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تقریباً نصف صدی تک فقہ و حدیث کی تطبیق، ان پر اعتراضات کے ازالہ اور فقہ وتصوف کے درمیان ارتباط قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اس کی بہترین مثال ان کی کتاب، تحصیل العرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف ہے۔ اسی دور میں شیخ احمد سرہندی (م: ۱۰۳۴ھ/ ۱۶۲۴ء) نے ترتیب فکروشعور اور تطہیر کردار وعمل کے نام پر اکبر اعظم (۱۶۰۵ء-۱۵۵۶ء) کی مذہبی پالیسی کے علاوہ تصوف وطریقت اور تشیع کے خلاف محاذ آرائی کی۔

ہندوستان میں مسلک اہل الحدیث کو شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (م: ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) نے مستحکم بنیادیں عطا کیں۔ انھوں نے ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء میں مکہ معظمہ کے ممتاز مشائخ ومحدثین سے اکتساب فیض کیا اور بقول خود مسالک اربعہ کے فقہاء واصول فقہ کا مقابلہ میں "نور غیبی کی مدد سے ان کا دل فقہائے محدثین کی روش پر مطمئن ہوگیا"۔ ۱۶؎ فقہ میں مفاہمت وتطبیق کا رویہ رکھا۔ اہل تسنن کے مسالک اربعہ کے علاوہ اہل تشیع سے عقل ونقل میں اور اہل طریقت سے شریعت میں مفاہمت کی کوشش کی۔ ان کا استدلال تھا

کہ ان میں ہر طریقہ اپنے لیے ایک مضبوط دینی بنیاد کا حامل ہے۔ اس لیے حق خالص یہ ہے کہ (افراط وتفریط اور شدت ترک کرکے) ان کو واضح اصول کی بنا پر جمع کیا جائے اور ان میں مطابقت پیدا کی جائے۔ ۱۷ انھوں نے اپنی کوششیں محض دینی افکار وعقاید تک محدود نہیں رکھیں بلکہ ان کو سیاسی تناظر عطا کیا۔ ارتجاعی نظام حکومت کو ختم کرکے عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے کا نظریہ عطا کیا۔ جس کے لئے ایک منظم سیاسی جماعت تیار کی۔ ۱۸ ان کے انقلابی نظریے کا عنوان کافک کل نظام (ہر بوسیدہ نظام کا خاتمہ) تھا جس کے لیے جہاد کو ضروری قرار دیتے تھے۔ وہ اخلاقی احیاء میں مقامی رسم ورواج کو مسلمانوں کی زندگی سے خارج کرکے دنیائے اسلام میں یک جہتی کے خواہاں تھے۔ ۱۹ سیاسی معیاروں پر ان کی تحریک کامیاب نہ ہوسکی لیکن ان کی کوششوں نے ہندوستان میں اہل الحدیث کو مستقل حیثیت عطا کردی۔ ۲۰ دبستان محدثی کے زیر اثر ۱۹۰۹ء میں اعظم گڑھ میں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد پڑی۔ اس طرح اہل الحدیث کو منظم کرنے کی جو تحریک شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے شروع کی تھی، ہنوز جاری وساری ہے۔

مسلک وہابی یا الموحدین:

اس مسلک کے بانی محمد بن عبد الوہاب (م: ۱۲۰۷ھ، ۱۷۹۲ء) نے عرب کے ریگزاروں سے ۱۷۳۶ء میں ابتداً تصوف کی مخالفت میں تحریک شروع کی۔ ایک کتاب التوحید الذی ھو حق اللہ علی علی المجید۔ لکھی ۲۱ جس میں توحید ونبوت سے متعلق ایسی باتیں لکھیں جو اہل تسنن کے مختلف مسالک کے درمیان افتراق واختلاف کا باعث ہوئیں۔ توحید کو مخصوص زاویہ نظر سے دیکھا۔ شرک کا دائرہ بہت پھیلا دیا۔ کسی شخص کی پناہ لینا شرک، کسی سے مدد لینا شرک، کسی شخص کو پکارنا شرک، کسی شخص سے فریاد کرنا شرک، کسی شخص کی نذر ونیاز وغیرہ۔ ابن عبد الوہاب نے آگے بڑھ کر خالق ومخلوق کے درمیان وسیلہ کی ضرورت سے بھی انکار کردیا جو وہابی عقیدہ کی اساس بن گیا۔ مسلک وہابی کے نزدیک کسی نبی یا رسول (جس میں سرکار ختمی مرتبت بھی شامل ہیں) یا ولی یا صالح کو شفاعت کا ذریعہ بنانا، تقلید کرنا یا کسی غیر خدا

سے شفاعت یا بخشش میں مدد کی توقع کرنا، کسی وسیلہ کا ماننا، کسی نبی یا ولی یا صالح کی قبر کی زیارت کے لیے جانا اور اسی طرح کے تمام افعال شرک اکبر ہیں۔ روضہ یا قبہ تعمیر کرنا وغیرہ بدعت ہے۔ فاتحہ دلانا، مزارات پر روشنی کرنا، پیری ومریدی اور مجاوری گناہ ہیں۔ حتیٰ کہ یوم ولادت رسول اکرم پر محفل میلاد بہ نیت ثواب کرنا بھی گناہ ہے۔ وہابی مسلک نے دیگر مسالک اہل تسنن کے برعکس رسالت اور آخرت کو علاحدہ سے اصول دین ماننے کی ضرورت نہیں سمجھی ان کے نزدیک ارکان دین۔ توحید، نماز روزہ حج اور زکوۃ ہیں۔ جہاد بھی ضمنی شے ہے۔

کتاب التوحید میں قرآنی آیات کی دلچسپ تاویلات پیش کی ہیں۔ مثلاً آیت: حتیٰ اذا جزع عن قلوبهم قالوا ماذا قال ربكم قالوا الحق وهو العلى الكبير یہاں تک کہ جب ان کے دلوں کی ہیبت دور کردی جائے گی تو پوچھیں گے کہ تمہارے پروردگار نے کیا کہا تو وہ جواب دیں گے کہ جو کچھ کہا ہے۔ حق کہا ہے اور وہ بلند وبالا اور بزرگ وبرتر ہے۔ (سبا۳۴/۲۳) کے متعلق لکھا: ''اشعریہ کے خلاف اللہ تعالیٰ کی صفات کا ثبوت''۲۲ یہ اسی طرح کی تاویل تھی، جو قرآنی آیات يداه مسبوطتان (اس کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں) (المائدہ ۵/۶۴) اور الرحمن على العرش استوىٰ (رحمٰن عرش پر سیدھا ہوکر بیٹھا) (طٰہٰ ۲۰/۵) کے متعلق ابن تیمیہ اور ان کے پیروکرتے رہے تھے۔ یعنی الفاظ کا ظاہری لغوی معانی مفہوم میں لیا۔ حالانکہ اس سے خدا کے جسم وجسمانیات کا مفہوم نکلتا ہے جو مسلمانوں کی اکثریت کے نزدیک عقیدہ توحید سے متصادم ہوتا ہے۔

تمام مسلمانوں کے عقائد افکار کی بنیاد تصور رسالت سے وابستہ ہے۔ وہ نبی اکرم کو امین وصادق مانتے ہیں۔ ان پر ایمان لائے تو انھوں نے جتنی باتیں کہیں، سب پر ایمان لائے۔ اللہ کی وحدانیت، قرآن کا نزول، جبریل کے ذریعہ وحی، حساب کتاب، یوم جزاء، جنت ودوزخ وغیرہ مسلمان سب کچھ نبی اکرم پر ایمان لانے کے نتیجہ میں قبول کرتا ہے۔ اس کے برعکس نبی اکرم کی حیثیت مسلک وہابی نے کمزور کردی پس دیگر مسلمانوں کا مسلک وہابی کے

خلاف ردعمل ایک فطری امر ہے۔ کیونکہ جہاد میں حاکمان جور(سامراجیت) کے خلاف خروج لازمی ہوسکتا ہے اور بادشاہت کی حمایت وسرپرستی مسلک وہابیت کی کامیابی کا سرچشمہ ہے۔

وہابی مسلک کے دفاع میں کہا جاسکتا ہے کہ اس نے دین اسلام میں ملاوٹ کے عمل کو روکنے میں اہم کام انجام دیا۔ توہم پرستی کو دین سے جدا کیا۔ مقامی رسم و رواج کو اسلام کا جزو بننے سے روکا اور اسے قرآن کے معیاروں پر استوار کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان دعوؤں میں صداقت ہے لیکن یہ نصف صداقت ہے۔ ان کوششوں کے نقصانات بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ وہابی مسلک نے اسلام اور مسلمانوں میں انتشار برپا کیا۔ تفرقوں میں شدت پسندی کے ساتھ اضافہ کیا۔ اپنے مسلک کے علاوہ دیگر مسالک کو کفر وزندقہ اور شرک وبدعت قرار دیا۔ ان کا جارحانہ رویہ عالم اسلام میں ہیجان وانتشار کا باعث بنا۔ ان کی پیروی نے دہشت پسند جنگ جوؤں کو پیدا کیا۔ جو ابھی حال میں طالبان کے نام سے امن عالم کے لئے خطرہ بنے اور جن کو نابود کرنے کے لیے عالمی طاقتوں نے تباہ کن اسلحوں کا استعمال کیا۔ علمی سطح پر تجزیہ کیا جائے تو اسلام میں ملاوٹ کے عمل نے ہر دور میں اپنے اثرات قائم کیے ہیں۔ خاص طور پر تفاسیر میں اسرائیلیت کا داخل ہوا، جس کا ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں تجزیہ کیا ہے۔ ۳۴ اسلام پر مقامی اثرات کی کارفرمائی سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مقامی اثرات قومی روایات کی شکل میں نہایت سلامت روی سے داخل ہوجاتے ہیں۔ ان کی مخالفت شدید ردعمل کا سبب بنتی ہے۔ ترکی کی مثال سامنے ہے۔ پھر وسوال اٹھتا ہے کہ اگر فقہی مسائل کے فیصلہ میں واضح احکام کی عدم موجودگی کی صورت میں قبل اسلام کے حجازی مراسم وروایات بنیاد بن سکتے ہیں اور انہیں استحسان، کالقب مل سکتا ہے تو کسی مسئلہ میں واضح احکام ہونے کی صورت کسی دوسری قوم کے مراسم وروایات کو بھی بنیاد بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ اسلامی قوانین سے متضاد نہ ہوں۔

مذکورہ بالا معاملات ومسائل ذہنوں میں متعدد نئے سوالات پیدا کرتے تھے، جن کا

جواب ملسک وہابیت میں نہ تھا۔ نتیجہ میں اپنے نئے مسلک کے آغاز کے چند برسوں کے بعد ۱۷۴۴ عیسوی میں ابن عبد الوہاب کو عینیہ سے خارج البلاد کردیا گیا۔ وہاں سے موصوف ۱۱۶۰ھ/۱۷۴۷ عیسوی) میں درعیہ پہنچے۔ یہ وہی سرزمین یمامہ ہے، جہاں سے مسلمہ کذاب اٹھا تھا، جس نے دعوائے نبوت کیا تھا! وہاں کا حکمراں موجودہ سعودی بادشاہ کا مورث اعلیٰ محمد بن مسعود تھا جو اس کا ہم نوا ہوگیا۔ ایک بڑا لشکر ترتیب دے کر فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔ اطراف وجوانب کے حکمرانوں کے پاس اطاعت وانقیاد کے خطوط بھیجے۔ بعضوں نے مرعوب ہوکر سر جھکادیا، باقی کو خوں ریز جنگوں کے ذریعہ مغلوب کیا گیا۔ مزارات کا انہدام شروع کیا۔ مزارات اہل بیت خصوصی نشانہ تھے۔ سب سے پہلے ۱۲۱۶ھ/ ۱۸۰۲ عیسوی کربلائے معلیٰ پر چڑھائی کی، روضہ امام حسینؓ میں توڑ پھوڑ کر کے مال و اسباب لوٹ لیا ہزاروں لوگوں کو بہیمیت وبربریت کا شکار ہونا پڑا۔ ۱۸۰۶ء میں وہابی افواج نے شدید قتل وغارت کے بعد مکہ معظمہ پر قبضہ کرلیا۔ وہابی افواج نے مکہ معظمہ میں مقبرے اور گنبد مسمار کیے، جن میں طائف النبی بھی شہید ہوئے۔ آخرکار ۱۸۱۴ عیسوی میں عثمانیوں (ترکوں) نے وہابیوں سے حکومت چھین لی اور ان کے سردار کا سر قلم کردیا۔ ان کی حکومت فقط بیس برس رہی۔ ۱۸۲۴ء میں وہابیوں نے ریاض اور نجد پر قبضہ کرلیا۔ ترکی نژاد سعودی شہری فیصل حکمراں ہوا۔ دوبارہ وہابی حکومت عبد العزیز بن عبد الرحمٰن السعود کی اولعزمی سے جنوری ۱۹۰۲ء میں قائم ہوئی۔ ستمبر ۱۹۳۲ء میں حکومت نے موجودہ نام اختیار کیا۔

ہندوستان میں مسلک وہابی مسلک اہل حدیث سے ہم آہنگ ہے۔ دونوں مسالک کی مذہبی سرگرمیاں یکساں ہیں۔ مدرسہ دیوبند، ندوۃ العلماء، مدرسۃ الاصلاح وغیرہ اہل الحدیث کے نشر واشاعت کا ذریعہ ہیں اور مسلک وہابیت کے بھی۔ حکومت سعودی عرب ان مدارس اور ان سے وابستہ علمائے اہل تسنن کے ذریعہ اپنے عقائد وافکار کی تبلیغ واشاعت میں ہر سال کروڑوں روپے صرف کرتی ہے۔ کتنے ہی جبہ ودستار درشاعی پرخم نظر آتے ہیں۔

مسالک اہل الحدیث والموحدین کم از کم برصغیر کی حد تک الگ الگ مسالک نہیں رہ گئے ہیں۔ دونوں کا مشترکہ نام غیر مقلدین ہے۔ حالانکہ انہیں ہنوز اہل تسنن میں اکثریت حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس میں اہل تسنن کے ممتاز علماء کی شمولیت اور ہر سال مدارس سے ہزاروں فارغ التحصیل مولویوں کی فوج ظفر موج اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے لئے سرگرم عمل ہے۔ مقلدین بھی اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے لیے غیر مقلدین کے مدرسوں میں داخل کرتے ہیں، جن میں تعلیم کے دوران قلب ماہیت ہوجاتی ہے مقلدین نے اس خطرہ کو محسوس کر کے اپنے الگ ادارے قائم کرنا شروع کر دیے ہیں، لیکن ان کی علمی وتدریسی اوقات حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔ مقلدین کے علمی ادارے جو درس نظامی کے لئے صدیوں تک برصغیر میں ممتاز رہے، غیر مقلدین کے اداروں کے سامنے اپنی رونق کھو بیٹھے ہیں۔

مسلک مقلدین:

اہل تسنن میں مقلدین کا الگ سے کوئی مسلک ان معنوں میں نہیں قرار دیا جاسکتا کہ ان کا انفرادی فقہی ضابطہ ہو، مقلدین میں اکثریت فقہ حنفی کی پابند ہے۔ جس میں ان کے اور غیر مقلدین کے درمیان کوئی وجہ امتیاز نہیں ہے لیکن علمی مسائل میں بعض پہلوؤں سے دونوں ضمنی مسلاک میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مقلدین اور غیر مقلدین کے ناموں سے ہی دونوں ضمنی مسالک کا فرق نمایاں ہے اور دونوں ایک دوسرے کا رد عمل معلوم ہوتے ہیں۔ برصغیر میں اہل تسنن کی اکثریت کی ۸۰ فی صد مقلدین میں شامل ہے۔ ان میں صوفیہ کے مختلف سلاسل (سلسلہ نقش بندیہ میں بعضوں کو چھوڑ کر)، جن کا حلقہ بیعت پورے برصغیر پر محیط ہے، مقلدین کے دائرہ کو وسیع تر کر دیتے ہیں۔ ان کے مختلف ومتعدد ادارے سرگرمی سے رد غیر مقلدین میں عمل پیرا رہتے ہیں۔ صوفیہ کے مزارات پر عرس، قل، فاتحہ چادر وغیرہ کو غیر مقلدین شرک وبدعت اور گناہ جانتے ہیں، جبکہ ان کے مقلد عقیدت مندوں کے لئے روحانی ارتفاع کا ذریعہ ہیں۔ ان میں قوالی کی محفلیں عوامی مقبولیت کا سامان مہیّا ہیں۔ صوفیہ سے عقیدت مندی میں

مسلمانوں کے مختلف فرقے اور مسالک ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندو اور دیگر غیر مسلم بھی صوفیہ سے عقیدت میں مسلمانوں کے شانہ بشانہ نظر آتے ہیں۔ صوفیہ کے نظریات کی جڑیں ہندوستانی سرزمین میں پیوست ہیں۔ کیونکہ صوفیہ کی سرپرستی کی بنا پر غیر مقلدین کے لیے مقلدین کی بیخ کنی ممکن نہ ہوسکی، ورنہ انھوں نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

مقلدین کی ایک جماعت احمد رضا خاں بریلوی (م: ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کی پیرو ہے اور انھیں اعلیٰ حضرت کہتی ہے۔ جو سلسلہ قادریہ سے بیعت تھے لیکن انہیں دیگر سلاسل کی خلافت بھی حاصل تھی۔ اپنے افکار وعقاید کی تبلیغ کے لئے علوم وفنون متداولہ کو ذریعہ بنایا۔ ان کے معتقدین رضاخانی یا 'رضویہ' کہلاتے ہیں۔ اس ضمنی مسلک کے لوگ عقاید میں دیگر مقلدین سے مختلف نہیں ہوتے، البتہ ان میں قیام وسلام پر زیادہ زور ہوتا ہے۔ یعنی رسول اسلام پر کھڑے ہوکر سلام کہا جائے، جس کو غیر مقلدین بدعت وشرک قرار دیتے ہیں۔ مقلدین، غیر مقلدین، وہابی اور اہل الحدیث باہمی طور پر ایک دوسرے پر شرک وبدعت کا فتویٰ جاری کرتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ بسا اوقات کفر والحاد کا فتویٰ دینے سے نہیں چوکتے۔ البتہ اگر ان کے درمیان وجہ اشتراک تلاش کیا جائے تو صوفیہ کے علاوہ باقی تمام ضمنی فرقے اہل تشیع کی مخالفت میں ہم آہنگ ہیں۔ ان تمام ضمنی مسالک کے علماء اہل تشیع کی رد میں کتابیں لکھتے رہے ہیں جن کا جواب اہل تشیع کی جانب سے دیا جاتا ہے، پھر جواب الجواب کا سلسلہ لامتناہی شروع ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ اہل تسنن کے متعدد چھوٹے چھوٹے مسالک ہیں جن کا ذکر طوالت کے خیال سے ترک کیا جاتا ہے۔

حوالے:

۱۔ مناقب الامام الاعظم ابی حنیفہ، ج ۱ ص ۵۹

۲۔ ایضاً! ج ۱ ص ۹۶، ج ۲ ص ۳۶۔ ۱۳۲

۳۔ الکردری، مناقب الامام الاعظم ج ۲ ص ۱۰۹

۴۔ بن خلکان: وفیات الاعیان: ج ۲ ص ۳۰۳ (قاہرہ ۱۸۹۲ء)

۵۔ ابو یوسف: کتاب الخراج ص ۱۰۸، ۱۱۶

۶۔ موطا (مرتبہ زرقانی) ج ۲ ص ۱۰ ۔ ۳۰۲ (قاہرہ ۱۸۶۳ء)

۷۔ طبری ج ۳ ص ۲۵۰

۸۔ وطاج ۳ ص ۳۵۹

۹۔ موطا ص ج ۲ ص ۳۱۵، ۳۶۵، ۳۷۸

۱۰۔ ابن قتیبہؒ کتاب المعارف ص ۵۱۔ ۲۴۸ (۱۸۵۰ء)

۱۱۔ ابن حزم ص ۲۱۲ سلدفی اصول الفقہ ص ۶۶ (بلاق ۱۹۰۳ء)

۱۲۔ طبری ج ص

۱۳۔ H.S.J.Phiby : The Heart of Arabic Vol I P 18 (London 1922)

۱۴۔ سید ابو الاعلیٰ مودودی تجدید واحیائے دین ص ۱۷ (دہلی ۱۹۸۶ء)

۱۵۔ عبد العزیز ملفوظات (ترجمہ ایوب قادری) ص ۱۷۴ (کراچی ۱۹۶۰ء)

۱۶۔ ولی اللہ محدث انفاس العارفین ص ۱۹۳

۱۷۔ مظہر بقا: اصول اورشاہ ولی اللہ ص ۹۷۔ ۹۱۴ اسلام آباد ۱۹۷۳ء

۱۸۔ ولی اللہ: التفہیمات الٰہیہ ج ۲ ص ۱۲۰

۱۹۔ اشتیاق حسین قریشی برصغیر ہندو پاک کی ملت اسلامیہ ص ۲۲۹ (کراچی ۱۹۶۷ء)

۲۰۔ K.K. Nizami: Shah Wali Ullah and India Politics pp 133-145
(IslamicCulture Hyderabad Vol 25 1951)

۲۱۔ محمد بن عبد الوہاب: التوحید الذی ھو حق اللہ علی العبید: اردو ترجمہ عبد المالک مجاہد (مقام وسنہ ندارد)

۲۲۔ ۱۰۰ ایضا ایضا

۲۳۔ ایضا ایضا ص ۱۷

☆☆☆☆☆

فرهنگ و تمدن:

ڈاکٹر سید شاہد اقبال

بنگال کے صوفیائے کرام

بنگال سلطنت دہلی کا ایک دور دراز علاقہ تصور کیا جاتا ہے۔ جنوبی ہندوستان کے ساحلی علاقے ''سراندیپ'' میں اسلام کی شمع سب سے پہلے روشن ہوئی۔ یہ عرب سوداگر ہی تھے جن کے ذریعے اسلام کا پیغام جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک انڈونیشیا اور ملیشیا تک پہنچا اور ان سوداگروں نے بنگال کے جنوبی ساحلی علاقوں تک اسلام کا پیغام پہنچا دیا تھا، چنانچہ اس زمانے میں ایک عارف باللہ حضرت خواجہ بایزید بسطامیؒ (م، ۲۶۱ھ) نے چاٹگام (جنوبی بنگلہ دیش) میں قدم رنجہ فرمایا اور بندگان خدا کو اسلام کی دولت سے سرفراز فرمایا۔

بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی وجہ کیا ہے؟ یقیناً اسلامی حکومت کا نتیجہ نہیں کیونکہ اگر اس کی وجہ یہ ہوتی تو صوبہ جات متحدہ آگرہ، اودھ اور دہلی میں جو صدیوں سے اسلامی حکومت کا مرکز رہے، مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ بنگال میں جو مسلمانوں کی اکثریت ہے اس کا اسلامی فتوحات یا اسلامی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت مسلمان بادشاہوں کی تلوار سے نہیں ہوئی۔ بلکہ ان علماء اور صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی جن کی زندگی کا مقصد ہی انسان دوستی اور اسلامی تعلیمات کی تبلیغ تھا۔ ہندوستان میں صوفیائے کرام نے اسلام کی وہ خدمات انجام دی ہے جو بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہوں سے بھی نہ بن پڑی۔ ہندوستان میں صوفیوں کے آستانوں کی اہمیت کسی بادشاہ کے دربار سے کم نہ تھی بلکہ بڑے بڑے بادشاہوں کے سر بھی ان کے آستانوں پر جھکے رہتے تھے۔

زیر نظر مقالہ میں بنگال (مشرقی بنگال (بنگلہ دیش اور مغربی بنگال) کے بعض اہم صوفیائے کرام کے مختصر احوال قلمبند کیے جارہے ہیں۔

حضرت علامہ اشرف الدین ابوتوامہ سونارگاؤں (بنگلہ دیش)

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمدؒ کے استاد حضرت علامہ اشرف الدین ابو توامہؒ بخارا کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے عراق گئے اور شاہ عراق کے حکم پر سلطان غیاث الدین بلبن کے دور حکومت (۱۲۶۸ء تا ۱۲۸۱) میں ہندوستان تشریف لائے اور دہلی میں رہائش پذیر ہوکر لوگوں کے درس وتدریس اور تربیت باطنی میں مشغول ہوئے۔ آپ کے علمی، دینی اور دنیوی علوم سے آپ کی واقفیت کا شہرہ پورے ملک میں ہوا چنانچہ طالبان علم اور ارادتمندوں کا سیلاب امنڈ پڑا۔ آپ کے مکان پر ہر وقت ہزاروں کا مجمع ہونے لگا۔ رجوع عام اور درباری علماء کی ریشہ دوانیوں اور حاسدوں کی سازشوں کے نتیجے میں سلطان دہلی کو خطرہ محسوس ہوا۔ دربار سے سیاسی مصلحت کی بنا پر بنگال چلے جانے کا حکم ہوا۔ آپ شاہی حکم کے مطابق مع اہل وعیال دہلی سے بنگال کے لئے روانہ ہوئے جب منیر شریف (ضلع پٹنہ) پہنچے تو شیخ احمد یحییٰ منیریؒ (والد حضرت مخدوم جہاںؒ) نے بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔

حضرت ابوتوامہؒ نے چند دن منیر شریف میں قیام فرمایا پھر حضرت مخدوم جہاں کو ساتھ لیا اور بنگال کے سفر پر روانہ ہوئے۔

حضرت علامہ ابوتوامہؒ ۶۶۸ھ/۱۲۷۰ء میں بنگال کے شہر سونارگاؤں میں جلوہ افروز ہوئے ایک خانقاہ اور مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور تاحیات ۷۰۰ھ/۱۳۰۱ء درس وتدریس اور رشدوہدایت خلق پر مامور رہے۔ سونارگاؤں، مغلیہ دور حکومت سے قبل ایک بڑا اور تاریخی شہر تھا۔ یہ بنگال کے اکثر حکمرانوں کا پایہ تخت رہا ہے۔ آج بھی حضرت ابوتوامہ اور ان کے ورثا کے مزارات مسجدوں اور خانقاہوں کے کھنڈرات اس شہر کی عظمت رفتہ ماضی کی شان وشوکت

اور تاریخی اہمیت کا پتہ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد صغیر حسن معصومی کا خیال ہے کہ ''سنارگاؤں نامی یہ جگہ بنگلہ دیش میں نرائن گنج کے قریب واقع ہے۔ جس کو آج کل ''سرنا گرام کہا جاتا ہے۔ سنارگاؤں ۱۰۴۱ھ میں بنگال وبہار کے ساتھ محمد بن بختیار خلجی کے قبضے میں آیا۔ اس کی علمی اور ثقافتی عظمت اس وقت ختم ہوگئی جب بنگال کے آخری خود مختار حکمراں موسیٰ خاں کو شہنشاہ جہانگیر کے حکم سے اسلام خاں (گورنر بہار) نے شکست دی۔

حضرت علامہ ابو توامہ کی کئی تصانیف کا پتہ چلتا ہے جس میں ایک قلمی مثنوی بنام ''حق'' ہے جو ۱۵ر جمادی الاول ۶۹۲ھ کو مکمل ہوئی تھی۔ یہ مثنوی ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کلکتہ میں موجود ہے اور فہرست کتب میں اس کتاب کا نمبر ۵۴۸ ہے اس مثنوی میں ۱۸۰ اشعار اور دس باب ہیں۔

خواجہ بایزید بسطامیؒ: چاٹگام (جنوبی بنگلہ دیش):

حضرت مخدوم شاہ شعیبؒ مناقب الاصفیا'' میں تحریر فرماتے ہیں۔ ''حضرت معروف کرخی جو سارے جہاں کے پیشوا ہیں۔ آپ ہی کے دسترخوان کے پروردہ حضرت خواجہ بایزید بسطامی جو عارفوں کے سلطان ہیں آپ ہی کے گلستان کے خوشہ چین تھے[۱] (ص، ۱۴۳)

مخدومنا مولانا اعلیٰ کمال دانشمند ابن تصنیف مصفی میں جو سیر مصطفیٰ میں ہے شیخ ابوطالب مکی صاحب تصنیف قوت القلوب کی ایک تصنیف کے حوالے سے طبقات صوفیہ کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پانچویں طبقہ میں خواجہ معروف کرخی زاہد تھے اور چھٹے طبقہ میں خواجہ بایزید بسطامی تھے جن کا وصال ۱۵ر شعبان ۲۶۱ھ تحریر کیا ہے۔ جبکہ ولادت ۱۲۶ھ دوشہر بسطام ہے) اس طرح جب خواجہ بایزیدؒ حضرت معروف کرخی سے متاثر ہوئے تو بلاشبہ وہ حضرت امام علی رضاؑ کے زمانے میں تھے۔

حضرت بایزید بسطامی جن کے اعلیٰ مرتبت اور بلندی درجات کی شہرت ہے برسہا برس

آپ (حضرت صادقؒ) کی غلامی میں رہے اور ان کو جو مقام حاصل تھا وہ آپ ہی کی غلامی کی برکت سے تھا۔ جیسا کہ خود بایزید کا قول ہے کہ میں چار سو پیروں کی خدمت میں رہا لیکن جب جعفر صادقؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تب مسلمانوں کی دولت نصیب ہوئی۔ (ص۔ ۱۳۸)

ایک روز حضرت بایزیدؒ آپ کی (حضرت جعفر صادقؒ) کی خدمت حاضر تھے، آپ نے ان سے فرمایا کہ فلاں کتاب طاق پر سے لے آ۔ بایزید نے پوچھا ''طاق کہاں ہے۔'' آپ نے فرمایا ایک مدت سے یہاں ہو اور یہ بھی نہیں جانتے کہ طاق کہاں ہے؟ اب تک طاق بھی نہیں دیکھا؟ بایزیدؒ نے کہا مجھے ان چیزوں سے کیا سروکار؟ مجھے آپ کے آگے سے اٹھنے کی مجال کہاں؟ میں ادھر ادھر دیکھنے کے لئے تو آیا نہیں؟ آپ نے یہ بات سن کر فرمایا جب ایسی بات ہے اور تمہارا یہ حال ہے تو اب بسطام چلے جاؤ تمہاری تکمیل ہوگئی۔ (ص۔ ۱۳۸) ۱۲

حضرت جنید بغدادیؒ نے ان کے متعلق فرمایا کہ بایزیدؒ ہمارے درمیان اس طرح ہیں جیسے ملائکہ میں جبرئیل

جنوبی بنگلہ دیش کے ساحلی شہر چاٹگام میں حضرت بایزید بسطامیؒ کا چلہ ہے۔ مقامی روایت کے مطابق حضرت بایزید بسطامیؒ سمندری راستے سے بنگال کے جنوبی ساحل پر پہنچے تو انہوں نے اپنے لئے ایک چٹائی (جائے نماز) کی جگہ طلب کی تھی۔ اس وجہ سے اسے چاٹ + گاؤں = چاٹ گاؤں۔ گرام چاٹگام کہا جانے لگا۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے جنوبی بنگلہ دیش اور شمالی برما (صوبہ ارکان) کے علاقے میں تبلیغ دین کا کام کیا اور ایک وسیع حلقہ مشرف بہ اسلام ہوا۔

بنگال کی تاریخ تصوف میں حضرت بایزید بسطامیؒ کا نام اکثر آتا ہے۔ جنوبی بنگلہ دیش کے ساحلی شہر چاٹگام سے پانچ میل کے فاصلے پر نصیر آباد'' قصبہ واقع ہے وہاں ایک پہاڑی پر ان کا مزار ہے۔ در اصل یہ ایک مسجد بایزید کے چلہ کی جگہ ہے جسے مزار کی شکل دے دی گئی ہے اس کے ساتھ ایک مسجد بھی ہے اس مزار پر زائرین کا ہجوم رہتا ہے۔

بنگال میں آپ کے ورود مسعود سے متعلق مختلف کہانیاں ہیں۔ لیکن تحقیق کی روشنی میں یہ بات ثابت ہے کہ نویں صدی عیسویں کے آخر میں چاٹگام کے قصبہ نصیر آباد میں تشریف لائے۔ نصیر آباد کی ایک پہاڑی پر قیام فرمایا اور یہیں آپ کی خانقاہ تھی۔ یہ مقام شہر چاٹگام سے پانچ میل دور جانب شمال واقع ہے یہ علاقہ گھنے جنگلوں اور وحشت ناک فضاؤں میں گھرا تھا۔ یہاں وحشی جانوروں اور خطرناک درندوں کا بسیرا تھا۔ خبیثوں اور جنوں کا مسکن تھا۔ لیکن قوت ایمان رکھنے والے مومن ہر خطرناک قوت کا مقابلہ کرسکتے ہیں چنانچہ بلا خوف آپ اس ویران وسنسان پہاڑی پر ریاضت وعبادت میں مصروف رہے۔ آندھی ہو یا طوفان ہر حال میں ہر موسم میں یہ چراغ جلتا رہا۔ یہ چراغ آج تک نصیر آباد (کی پہاڑی) پر آپ کے حجرہ میں آپ کی مستقل مزاجی، عزم راسخ اور خدا پرستی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ وہ چراغ ہے جس سے دین وایمان کے کتنے ہی چراغ جلتے رہے اور کفر وشرک کی تاریکی دور ہوتی رہی۔ اور ایمان والوں کے قلوب انوار محمدی اور تجلیات خداوندی سے منور ہوگئے۔

جس پہاڑی پر حضرت بایزید بسطامیؒ کا آستانہ ہے اسکے دامن میں وضو کے لئے ایک تالاب ہے۔ اس میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اس تالاب میں بڑی مچھلیاں اچھلتی کودتی اور بڑے بڑے کچھوے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کچھوؤں کے بارے میں عجیب وغریب قصے اور کہانیاں مشہور ہیں۔

ایک روایت یہ ہے کہ یہ کچھوے دراصل 'جن' تھے حضرت بایزید بسطامیؒ کو عبادت کے وقت ستایا کرتے تھے۔ ایک بار آپ نے اللہ سے یہ دعا کی۔

''بارالٰہا! یہ جن' تیری عبادت کے دوران مخل ہوتے ہیں ان سے نجات دلا' چنانچہ اللہ کے حکم سے یہ جن کچھوے بن گئے'' واللہ عالم بالصواب۔

زائرین ہزاروں ہزار کی تعداد میں روزانہ آتے ہیں ان کچھوے کو ''زک'' بیچنا منع ہے۔ زائرین انہیں 'پھری' بھنا ہوا چاول) کھانے کے لئے دیتے ہیں۔

شیخ جلال الدین مجرد کیانیؒ (بنگلہ دیش):

شیخ جلال الدین مجرد بزرگان دین میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں حضرت شیخ جلال الدینؒ نے ۱۳۰۳ء میں راجا جا گور گوبندی کی سرکوبی کے لئے ۳۱۳ مجاہدین کو لے کر سکندر غازی کے ساتھ سہلٹ پر حملہ کیا تھا۔ سہلٹ کی فتح کے بعد حضرت جلال الدینؒ نے اپنے ساتھیوں میں تمام تر فتوحات تقسیم کردی اور ہر ایک کو شادی بیاہ کی اجازت دے دی اور خود بھی سہلٹ میں مستقل طور پر سکونت پزیر ہوئے۔ [۳]

شیخ محمد اکرم نے آب کوثر میں ان کی تاریخ وفات ۲۰/ ذیقعدہ ۷۴۰ھ/ ۱۸/ مئی ۱۳۴۰ء لکھی ہے۔ تاریخ وفات ''شاہ جلال مجرد قطب بود'' کے جملے سے نکلتی ہے۔

ابن بطوطہ ۲۲-۱۳۱۱ء میں بنگال سے گزرا تو شاہ جلالؒ کی خدمت میں حاضر ہوا جب وہ ۱۳۴۷ء/ ۷۴۶ھ میں چین پہنچا تو اسے شاہ جلالؒ کی وفات کی خبر ملی شاہ جلال کا انتقال ۷۵۵ھ/ ۱۳۴۴ء میں ظہر کی نماز کے آخری سجدے میں ہوا اس وقت آپ کی عمر ۱۵۰ برس کی تھی۔ اس سے سن پیدائش ۵۹۵ھ/ ۱۱۹۸ء قرار پاتی ہے۔

ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ وہ (شاہ جلالؒ مجرد کیانی) بدن کے ہلکے پھلکے تھے، قد لانبا تھا اور رخسار لگے ہوئے تھے، ایک غار میں پڑے ہوئے یاد الٰہی میں غرق رہتے تھے۔ اور چالیس سال سے برابر روزے رکھتے تھے۔ دس دن میں ایک دفع افطار کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ پر اس (پہاڑی) ملک کے اکثر باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے۔ اس ملک کے ہندو اور مسلمان سب شیخ کی زیارت کو آتے ہیں اور ان کے لئے تحفے اور نذر لاتے ہیں۔ اس سے فقرا اور مساکین کھاتے ہیں اور شاہ جلال فقط اپنی گائے کے دودھ پر گذر کرتے ہیں۔ سہلٹ میں اب بھی لوگ شاہ جلال کے گن گاتے ہیں شمال مشرقی بنگال اور سہلٹ میں اسلام کی اشاعت شاہ جلالؒ ہی کی مرہون منت ہے۔

تاریخ کی کتابوں میں سہلٹ کا اصل نام سری ہٹہ ملتا ہے۔ جو سری ہٹ سے بنا

ہے۔ مسلمان اسے ایک سرحدی مقام کی مناسبت سے ''سرحد'' یا ''سل حد'' (یعنی سرحدی پتھروں کے ستون) کہتے تھے۔ ایک کتبہ جو ڈھاکا میوزیم میں محفوظ ہے اس میں سلہٹ کے لئے ''سرہٹ'' استعمال ہوا ہے۔ سلہٹ کے نام کے سلسلے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے کہ حضرت شاہ جلالؒ نے 'سل (پتھر) کو سامنے سے ہٹ جانے کا حکم دیا تھا۔ اس وقت یہ مقام سلہٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اسے حضرت شاہ جلالؒ کے نام پر جلال آباد بھی کہا جاتا ہے مسلمانوں کی آمد سے قبل سلہٹ آسام میں کامروپ کی سلطنت کا ایک حصہ تھا۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں یہ کبھی آسام کبھی بنگال کا حصہ رہا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد یہ مشرقی بنگال کے حصہ میں آیا تھا لیکن اس کا ایک سب ڈویژن ''کریم گنج'' کاٹ لیا گیا۔ اب کریم گنج ریاست میگھالیہ کا ایک ضلع ہے۔

قیام بنگلہ دیش کے بعد یہاں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا گیا ہے اور اب ''شاہ جلال عربی یونی ورسٹی قائم کی گئی ہے۔ مذکورہ مدرسہ میں تقریباً پانچ ہزار طلبا تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

سلہٹ ایک صحت افزا پہاڑی مقام ہے۔ اس کے قریب سرما ندی بہتی ہے اور یہاں چائے کے باغات ہیں۔ انناس اور کیلا اس علاقے میں کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔

شاہ جلال نے اس زمانے میں دیکھا کہ سلہٹ کی مٹی خوشبو اور رنگ میں اس مٹی سے ملتی تھی جو آپ کے ماموں نے آپ کو دی تھی۔ آخر آپ نے اپنے رفقاء کے ساتھ (جو اس پر تیار تھے) سلہٹ میں آباد ہونے کا فیصلہ کیا۔

تیس سال تک شاہ جلال نے ایک غار میں عبادت کی اس کے بعد آپ کے ماموں نے آپ کی ایک کرامت دیکھ کر ایک مٹھی خاک اندر سے لاکر دی اور فرمایا کہ اب تم دنیا کی سیاحت کرو۔ اور جس سرزمین کی مٹی اس مٹی کی طرح بو باس، رنگ اور ذائقہ رکھتی ہو، وہیں یہ مٹی ڈال دینا اور اسی جگہ اقامت اختیار کرلینا۔

چنانچہ حضرت شاہ جلالؒ اس ارادے سے روانہ ہوئے اور یمن کے ایک شہر ہاور سے

دہلی ہوتے ہوئے جہاں آپ کی ملاقات حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء (پ: ۶۳۱ھ۔م ۷۲۶) سے ہوئی ہے اپنے رفقاء درویشوں کے ساتھ سلہٹ پہنچے۔

سلہٹ میں قیام فرمانے کے بعد ۳۳ سال شاہ جلالؒ مجرد حیات رہے اس مدت میں آپ کا ابتدائی زمانہ تو یہاں کے انتظامات کو درست کرنے میں گذر باقی تمام وقت تبلیغ دین اور رشد وہدایت میں بسر ہوا۔

چہل غازی کی درگاہ (شمالی بنگلہ دیش):

چہل غازی کی درگاہ در اصل چالیس نمازیوں کا مدفن ہے۔ ڈاکٹر وقار اشدی نے اپنے ایک مقالہ میں "چہل نمازی" کا تعارف کرایا ہے۔ انہوں نے ان نمازیوں کو "شیخ کبار" کے لقب سے یاد کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ لوگ حضرت بختیار کاکیؒ" (۵۴۹ھ۔ ۱۱۳۳ء) کے خلفاء میں سے تھے۔ جنہوں نے دین کی تبلیغ واشاعت کے لئے بنگال کا سفر اختیار کیا اور یہاں مستقل طور پر سکونت پذیر ہوئے۔

مذکورہ "چہل غازی" کی درگاہ شمالی بنگلہ دیش کے ضلعی صدر مقام دیناج پور سے چھ کیلومیٹر جانب شمال دیناج پور رنگ پور قومی شاہراہ پر واقع ہے۔ آج بھی سبھی گاڑیوں کے سوار اس جگہ پر اپنی اپنی گاڑیاں روک دیتے ہیں اور سلامی دروازے پر سلامی دینے کے بعد آگے بڑھتے ہیں۔

۱۹۶۰ء کے عرصے میں "چہل غازی" کی درگاہ کے قریب دیناپور گورنمنٹ ڈگری کالج قائم کیا گیا تھا۔ اب یہ کالج بنگلہ دیش کا ایک اہم تعلیمی مرکز تصور کیا جاتا ہے۔

۱۹۵۰۔۵۱ء میں لیاقت نہرو سمجھوتے کے بعد بڑی تعداد میں بہار سے ہجرت کرکے جانے والے مسلمانوں کو اس درگاہ کے قریب بسایا گیا تھا۔

ایک اہم واقعہ ۱۹۷۱ء کا ہے جب قیام بنگلہ دیش کی لڑائی جاری تھی اس وقت قوم پرست بنگالیوں کے ذریعہ غیر بنگالیوں کو ہلاک کیا جارہا تھا۔ جب بہاری مسلمانوں کا ایک

گروہ ''چہل غازی کی درگاہ کے احاطے میں داخل ہوا،قوم پرست بنگالیوں کے ذریعہ ان پر چاروں طرف سے گولیاں چلائی جارہی تھیں لیکن تمام گولیاں دیوار سے ٹکراکر واپس ہوجاتی تھیں۔

زندہ بچ جانے والے ایک بزرگ نے بعد میں مجھ سے بتایا کہ تمام بہاری مسلمانوں نے ''چہل غازی'' کی درگاہ پر دعا کی ان لوگوں کو بشارت ہوئی کہ اللہ کا حکم نہیں ہے۔

بالآخر تمام بہاری مسلمان شہید کردئے گئے (رہے نام اللہ کا!)

شیخ تقی الدین سہروردی مہسویؒ (مغربی بنگال):

شیخ تقی الدین سہروردی ساتویں صدی ہجری میں مہسو شریف (دیناپور) تشریف لائے اور یہیں سکونت اختیار فرمائی۔

آپ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلیفہ شیخ احمد دمشقیؒ کے مرید تھے۔آپ جید عالم تھے۔آپ نے امام غزالی کی مشہور کتاب '' احیاء العلوم'' کی شرح احیاء العلوم'' تصنیف فرمائی۔

آپ کی وفات کا سال معلوم نہیں۔آپ کا مزار مہسو شریف ضلع شمالی دیناجپور (مغربی بنگال) میں ہے جو بہار کے دینارشہر سے تقریباً سوکلومیٹر جنوب مشرق اور شمال دیناج پور کے ضلع دیناپور کے صدر مقام اسلام پور سے پانچ کلومیٹر مشرق میں واقع ہے۔

شیخ حسین غریب ڈھکر پوش مغربی بنگال:

شیخ حسین ڈھکر پوش حضرت علاؤ الحقؒ کے عظیم المرتبت خلفاء میں سے ہیں۔اپنی تعلیم اور روحانی تربیت کے بعد شیخ حسین نے پورینا کو مرکز بنا کر ترویج اسلام کا کام شروع کیا اور یہیں شیخ حسین نے ایک خانقاہ بھی تعمیر کی۔جس زمانے میں بنگال میں راجا گنیش کے مظالم بڑھ گئے تھے۔اس نے آپ کے صاحبزادے شاہ حسین کو شہید کردیا تھا۔حضرت سید اشرف جہانگیرؒ کو جب یہ معلوم ہوا تو انہوں نے آپ کو ایک ہمدردانہ اور تعزیتی خط لکھا۔آپ نے

اس خط میں تحریر فرمایا۔

جو لوگ اللہ کے راستے پر چلتے ہیں ان کو بہت سی آفات ارضی وسماوی کو سہنا پڑتا ہے اور مختلف تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ امید ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ سہروردیہ اور سابقہ صوفیاء کرام کے روحانی فیض سے بہت جلد یہ اسلامی قلمرو بدبخت کافروں سے آزاد ہوجائے گا۔ شاہی فوج یہاں سے روانہ کی جارہی ہے تاکہ وہ مسلمانوں کی مدد کرسکے اور جلد نتائج ظاہر ہوں۔

میرے مخدوم زادہ جو کہ گلستان علائی اور خالدیہ خاندان کے ایک مہکتے ہوئے پھول ہیں میں انہیں اس درویش کی حمایت کا مکمل یقین دلاتا ہوں۔

حضرت سید شہاب الدین پیر جگجیتؒ (م۔ ۶۶۶ھ/ ۱۲۵۶) کی تیسری صاحبزادی حضرت بی جی کا کوئی تھیں۔ جن کا مزار صوبہ بہار کے موضع کاکو (جہاں آباد) میں مرجع خلایق ہے اور جن کی بزرگی اور فیض سے زمانہ فیضیاب ہورہا ہے۔ آپ کی شادی حضرت مخدوم مسلمان لنگر زمین کاکوی بن شیخ عبد العزیز منیری بن حضرت امام محمد تاج فقیہؒ سے ہوئی۔ جن کے صاحبزادے مخدوم عطاء اللہ صاحبزادی بی بی کمال ثانی (ہم نام والدہ) اور نواسے شیخ حسین عزیب دھکر پوش (م۔ ۸۰۲ھ اپنے وقت کے صاحب کشف وکرامت بزرگ شمار کیے جاتے ہیں۔

سفینہ تحریری ابو الحدیث حضرت شاہ یتیم اللہ سفینہ بازی کی رو سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کا مزار مہسو شریف (شمال دیناپور) میں حضرت خواجہ تقی الدین مہسوی کے مزار کے پائنتی میں ہے۔ اور یہ بھی اطلاع ہے کہ آپ کے والد ماجد حضرت حسام الدین ہانس بنیادی کا مزار بھی وہیں ہے۔

شیخ اخی سراج الدین عثمان آئینہ ھند ''مغربی بنگال:

آپ کا نام عثمان تھا۔ اجودھیا کے رہنے والے تھے۔ اس لئے آپ کو اودھی بھی کہا جاتا ہے۔ سلطان مشائخ حضرت محبوب الٰہی آپ کو'' اخی سراج الدین'' فرمایا کرتے تھے اور

حضرت محبوب الٰہی نے بھی اپنی زبان مبارک سے فرمایا تھا کہ " این آئینہ ہندوستان است"۔ اللہ کے فضل وکرم سے ایسا ہی ہوا۔ یہاں رشد و ہدایت کے چراغ سے کوچہ کوچہ روشن فرمایا اور آپ کی ذات سے پورے ہندوستان کو ہدایت ملی۔ اس لئے آپ کو آئینہ ہند کہا جاتا ہے۔ آپ محبوب الٰہی کے دسویں خلیفہ تھے۔ حضرت محبوب الٰہی کے سبھی خلیفہ عالی مرتبہ تھے لیکن شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی اخی سراج الدین آئینہ ہند کی بات کچھ اور ہی تھی۔ دونوں اکابرین سے کثیر تعداد میں لوگوں نے رشد و ہدایت پائی۔ شیخ اخی الدین تمام ظاہری و باطنی کمالات سے مزین تھے۔ عشق و محبت اور سماع میں دونوں بے نظیر تھے۔ عین جوانی کی حالت میں آپ مرید ہوگئے تھے اور لکھنوتی قدیم (بنگال) سے آکر سلطان مشائخ کے حلقہ بگوش ہوئے۔ آپ محبوب الٰہی کی خانقاہ میں رہتے تھے۔

آپ کے پاس کاغذ اور قلم دوات کے سوا کچھ نہ تھا۔ آپ جماعت خانہ کے ایک کونے میں پڑے رہتے تھے اور حضرت شیخ المشائخ کے علوم ظاہری و باطنی سے مستفیض ہوتے رہتے تھے۔

جب آپ کو بنگال کی خلافت ملی اور آپ نے چاہا کہ آپ اپنے وطن کو جائیں تو حضرت محبوب الٰہی کی خدمت میں حاضر ہوکر فرمایا کہ اس علاقے میں شیخ علاؤ الدین نام کے بڑے عالم و فاضل اور ذی جاہ و بزرگ رہتے ہیں وہاں کس طرح رہ سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا فکر مت کرو وہ تمہارا خادم ہوجائے گا اور یہی ہوا کہ اس علاقے میں سب سے پہلے جو شخص آپ کے مرید ہوئے وہ شیخ علاؤ الحق تھے۔ وہ صاحب کمال ہوکر خلافت سے مشرف ہوئے اور آپ کے جانشین و سجادہ ہوئے ان کی بدولت آپ کے سلسلہ کو کافی فروغ حاصل ہوا اور شہرت ملی۔ جب آپ کے وصال کا دن قریب آیا تو آپ نے لکھنوتی قدیم کے نواح میں جو آج کل موضع سعد اللہ پور ہے جو شہر مالدہ سے گیارہ کلومیٹر دور ہے اپنا مدفن پسند فرمایا۔ پہلے آپ نے وہاں سلطان المشائخ کے تبرکات وغیرہ جو ساتھ لائے تھے دفن کرائے اور وصیت کی

کہ مجھے ان تبرکات کے پائتی میں دفن کیا جائے۔ اسی وجہ سے آپ کا مزار قبلہ حاجات خلق بنا ہوا ہے۔ آپ کا وصال ۱۵۹۷ھ میں ہوا۔ حضرت مخدوم علاؤ الحق آپ کے مشہور ومعروف خلیفہ ہوئے جن سے آپ کے سلسلے کو خوب سربلندی حاصل ہوئی۔

مخدوم شیخ علاؤ الحق مغربی بنگال:

آپ کے والد بزرگوار کا نام عمر ابن اسعد لاہوری تھا۔ ''لطائف اشرفی'' میں لکھا ہے کہ آپ کا سلسلہ نسب حضرت خالد بن ولید'' سے ملتا ہے۔ آپ کا لقب علاؤ الحق گنج نبات (مٹھائی کا خزانہ) اور شیخ علاؤ الحق ہے۔ حضرت اخی سراج الدین عثمانؒ سے مرید ہونے سے قبل آپ علم جدوجہد وجاہ مترادف کی وجہ سے اپنے آپ کو گنجینہ نبات کہتے تھے۔ یہ سن کر شیخ المشائخ حضرت محبوب الٰہی نے غصہ میں آکر اپنے زانوں پر ہاتھ مارا اور فرمایا میرے پیر بھی خود کو گنج شکر کہتے تھے اور یہ بھی گنج نبات اس کی زبان کیوں نہیں جل جاتی؟ یہ کہنا تھا کہ ان کی زبان جل گئی اور وہ گونگے ہوگئے۔ مدت کے بعد جب اخی سراج الدین سے آپ مرید ہوئے تو آپ میں قوت گویائی واپس آئی۔

حضرت شیخ اخی سراج الدین کے وصال کے بعد مسند رشد وہدایت پر جلوہ فروز ہوئے اور آپ نے ایک جہاں کو فیض یاب فرمایا۔ آپ کے کمالات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ محبوب یزدانی حضرت سلطان اشرف جہانگیر سمنانی جیسے شاہ باز اور بلند پرواز بزرگ آپ کے مرید اور خلیفہ ہوئے۔ آپ کے اخراجات اتنے تھے کہ ایک بڑی حکومت بھی اسے برداشت نہیں کرسکتی تھی مگر آپ کا کشف تھا کہ آپ خود ان اخراجات کو پورا کرتے تھے۔

آپ کے کشف وکرامات بے شمار ہیں ہزاروں بندگان خدا نے آپ کے دست مبارک پر بیعت حاصل کی اور کتنے تصرفات دیکھ کر اللہ کے دین میں شامل ہوگئے۔

مولانا کرامت علی جونپوری:

مولانا کرامت علی کا مولد ومسکن جون پور کا مشہور محلہ ''ملا ٹولہ'' ہے۔ جہاں مولانا

کے خاندان کے اور لوگ بھی موجود ہیں۔ مولانا کی ولادت ۸ رمحرم الحرام ۱۲۱۵ھ کو ہوئی مولانا نے سماعت قرآن پاک کی سند بھی مولانا احمد اللہ اناوی سے لی تھی۔ ''مشاہیر جون پور میں شاہ عبد العزیز شاہ اسمٰعیل شہید سے بھی ان کے علمی استفادہ کا ذکر ملتا ہے۔

مولانا کو فقہ کے مسائل حد سے زیادہ یاد تھے سبع کے قاری تھے۔ قرآن مجید انتہائی خوش الحانی اور فطری درد وسوز کے ساتھ پڑھتے تھے۔ جب حج وغیرہ کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے تو وہاں کے قاریوں سے بھی مشق کی تھی۔

حضرت سید احمد شہید کی یہ روشن کرامت تھی کہ مولانا کرامت علی جون پوری کو ان کے شوق جہاد کے باوجود بنگال روانہ کردیا تھا۔ مولانا کرامت علی نے ۷۵ سال کی عمر پائی جس میں تقریباً ۵۱ سال بنگال اور آسام اور ان کے قرب وجوار میں دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہوئے گزارے۔ بنگال میں لاکھوں آدمی مولانا کے حلقہ ارادت میں داخل ہیں۔ کوئی شہر اور کوئی بستی باقی نہ ہوگی جہاں مولانا کے ارادتمند وفیضیافتہ موجود نہ ہوں۔ غرض کہ اس دیار میں ان کی برکت سے اسلام کی خوب اشاعت ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا کے ہاتھ پر تقریباً ایک کروڑ آدمیوں نے اسلام قبول کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ مشرقی بنگال کو مسلم بنگال بنانے میں مولانا کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔

مولانا نے یہ مبارک کام کرتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی یعنی ۳ ربیع الاوّل ۱۹۹۰ھ بروز منگل بنگلہ دیش کے ضلع رنگ پور شہر میں مولانا کی وفات ہوئی صاحب مشاہیر جون پور سید نور الدین نے ان کی تاریخ وفات ''بدرحمت ساطع النور باد'' لکھی ہے۔ دوسری تاریخ ورفات ''جناب کرامت علی مفتی' سے نکلتی ہے۔

مولانا کا مزار رنگ پور شہر کے محلہ منشی پاڑہ میں واقع ہے۔ اس مزار سے متصل مسجد اور گنبد تعمیر کردیا گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

تعلیم وتربیت:

پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین ہمدانی

خانقاہی مدارس میں نظام ونصاب تعلیم

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کا ایک تاریخی جائزہ

اللہ نے قرآن مجید میں قلم کی قسم کھائی ہے۔ اسلام نے ہر مسلم مرد وعورت کے لئے حصول علم ضروری قرار دیا ہے رسول اللہؐ کی علم سے متعلق کثیر تعداد میں احادیث موجود ہیں۔ گہوارہ سے لیکر قبر تک علم حاصل کرو، علماء کے دوات کی سیاہی شہداء کے خون سے افضل ہے۔ میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں۔ حضرت علیؑ کا قول ہے ''جس نے مجھے ایک لفظ سکھایا' اس نے مجھے اپنا غلام بنالیا۔ نہج البلاغہ علم کا ایک اہم ذخیرہ ہے۔ مولا علیؑ فرماتے ہیں'' انبیاء سے زیادہ خصوصیت ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو ان کی لائی ہوئی چیزوں کا زیادہ علم رکھتے ہوں''[1] پھر آپ نے اس آیت کی تلاوت فرمائی ابراہیم سے زیادہ خصوصیت ان لوگوں کو تھی جو ان کے فرمانبردار تھے اور اب اس نبی اور ایمان لانے والوں کو خصوصیت ہے۔ پھر فرماتے ہیں جو لوگوں کا پیشوا بنتا ہے تو اسے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے کو تعلیم دینا چاہئے اور زبان سے درس اخلاق دینے سے پہلے اپنی سیرت وکردار سے تعلیم دینا چاہئے اور جو اپنے نفس کی تعلیم وتادیب کرے وہ دوسروں کی تعلیم وتادیب کرنے والے سے زیادہ احترام کا مستحق ہے۔ پھر اپنے بیٹے حضرت حسنؑ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں'' چونکہ مجھے تمہاری (حسنؑ) ہر بات کا اتنا ہی خیال ہے جتنا کہ ایک شفیق باپ کو ہونا چاہئے اور تمہاری اخلاقی تربیت بھی

پیشِ نظر ہے لہذا مناسب سمجھا کہ یہ تعلیم وتربیت اس حالت میں ہو کہ تم نوعمر اور بساط دہر پر تازہ وارد ہو اور تمہاری نیت کوئی اور نفس پاکیزہ ہے اور میں نے چاہا تھا کہ پہلے کتاب خدا، احکام شرع اور حلال وحرام کی تعلیم دوں اور اس کے علاوہ دوسری چیزوں کا رخ نہ کروں لیکن اندیشہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ چیزیں جن میں لوگوں کے عقائد اور مذہبی خیالات میں اختلاف ہے تم پر اسی طرح مشتبہ نہ ہوجائیں جیسے ان پر مشتبہ ہوگئی تھیں باوجودیکہ ان غلط عقائد کا تذکرہ تم سے بھی مجھے ناپسند تھا مگر اس پہلو کو مضبوط کردینا تمہارے لئے مجھے بہتر معلوم ہوا۔'' یہ تھا طریقہ تعلیم جس کی طرف مولاعلیؑ نے اشارہ کیا۔ پھر تاریخ کی اہمیت کو ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں ''گذرے ہوئے لوگوں کے واقعات سامنے رکھنا۔ تمہارے پہلے کے لوگوں پر جو بیتی ہے اسے یاد دلانا۔ ان کے گھروں اور کھنڈروں میں چلنا پھرنا اور دیکھنا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے اگرچہ میں نے اتنی عمر نہیں پائی جتنی اگلے لوگوں کی ہوا کرتی تھی۔ پھر میں نے ان کی کارگزاریوں کو دیکھا ان کے حالات و واقعات میں غور کیا اور انکے چھوڑے ہوئے نشانات میں سیروسیاحت کی، یہاں تک کہ گویا میں انھیں میں سے ایک ہوچکا ہوں۔ بلکہ ان کے سب حالات ومعلومات جو مجھ تک پہونچ چکے ہیں ان کی وجہ سے ایسا ہے کہ گویا میں نے ان کے اول سے لیکر آخر تک انکے ساتھ زندگی گزاری ہے۔'' ؎

مولاعلیؑ کے یہ تمام ارشادات علم کی اہمیت، تعلیم وتربیت کا طریقہ تاریخ کے مطالعہ کی اہمیت کی واضح طور پر عکاسی کرتے ہیں۔

رسول اللہؐ نے ایسے تعلیمی نظام کی بنیاد ڈالی جو سب کے لئے تھا۔ اس سے پہلے دنیا کے دوسرے مذاہب نے جو نظام تعلیم قائم کیا تھا وہ کچھ طبقات تک محدود تھا۔ لیکن اسلامی تعلیمی نظام کی وسعت کا خاتمہ ۶۶۱ء میں قیام ملوکیت پر ہوگیا۔ جس کے بانی

معاویہ تھے۔ بنی امیہ کی حکومت کا دارومدار ہی عصبیت پر تھا۔ لہذا اب تعلیم کے دروازے غیر عرب اور نئے مسلمانوں کے لئے بند کردیے گئے اسلام تو علم کی روشنی میں یقین رکھتا ہے جہالت کے اندھیروں میں نہیں ۔لیکن حکمراں بنی امیہ بنی عباسیہ سلاطین اور بادشاہوں نے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کو تعلیم کے حق سے ایک سازش کے تحت محروم کردیا ملوکیت کے قیام کے بعد تصوف نے تحریک کی شکل اختیار کی اور صوفیا نے علم کی روشنی کو عام کرنے کے لئے اپنی خانقاہوں میں مدارس قائم کئے جس کے دروازے سب کے لئے کھلے رکھے اور اس طرح صوفیا نے تعلیم کے میدان میں این جی او یعنی غیر سرکاری تنظیم کا کام برائے اصلاح سماج اور تعلیم کی روشنی کو پھیلانے کا کارنامہ انجام دیا جبکہ لوگ اس زمانہ میں اس سمجھ اور فکر سے قطعی واقف نہ تھے۔ اس لئے کہ سرکاری امداد اور علماء کے قائم کردہ مدارس میں تعلیم سماج کے اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو دی جاتی تھی۔

جب یہ صوفیاء ہندوستان آئے تو یہاں دو طرح کے مدارس تھے ایک سرکاری مدارس اور دوسرے علماء کے قائم کردہ مدارس۔شروع کے دور میں حوض شمسی ایک بڑا علمی مرکز بن کر ابھرا۔ پھر مدرسہ معزی، ناصریہ، علائی اور حوض خاص وجود میں آئے ۔صوفیا نے ہندوستان میں خانقاہی مدارس کی بنیاد ڈالی۔ یہ اس لئے ضروری تھا کہ سرکاری اور علماء کے قائم کردہ مدارس کا نصاب ان کی اپنی فکر کے مطابق تھا اور صوفیا اس نصاب سے پوری طرح اتفاق نہیں رکھتے تھے۔ پھر علماء کے قائم کردہ مدارس میں سماج کے اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کو تعلیم دی جاتی تھی اس کے برعکس خانقاہی مدارس میں رنگ ونسل نقر وامارت، ترک وغیر ترک یا ہندوستانی مسلمان یا ایرانی مسلمان میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہ تھی۔ امیر خسرو کیونکہ ہندوستانی مسلمان تھے لہذا انہوں نے

اپنا تعلق خانقاہی زندگی سے رکھا تا کہ ہندوستانی مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کے ساتھ کسی قسم کا تعصب نہ برتا جائے۔ اس لئے کہ سلطان التمش اور بلبن کی یہ پوری کوشش رہی کہ کوئی عہدہ کسی ہندوستانی مسلمان کو نہ ملے۔ ۴ خانقاہی مدارس میں زیادہ توجہ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف پر تھی لیکن سرکاری مدارس میں زیادہ توجہ فقہ پر رہتی اور تصوف پر کچھ بھی نہیں۔ صوفیا اپنے خاص مریدوں کو عوارف المعارف کا درس دیتے لیکن عوارف المعارف صرف انہیں شاگردوں کو پڑھاتے ہیں جسمیں یہ صلاحیت دیکھتے کہ وہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کسی قصبہ میں خانقاہی نظام کو قائم کرسکیں گے۔ صوفیاء تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی اتنا ہی دھیان دیتے۔ ایک مرتبہ شیخ فرید الدین اپنے مریدوں کو عوارف المعارف پڑھا رہے تھے لیکن جس نسخہ سے وہ پڑھا رہے تھے وہ درست نہ تھا لہٰذا ساتھ ساتھ اصلاح بھی کرتے جارہے تھے شیخ نظام الدین اولیاء بھی اس درس میں شامل تھے انہوں نے کہہ دیا کہ شیخ نجیب الدین متوکل کے پاس بہتر نسخہ ہے۔ اس پر شیخ فرید نے کہا کہ کیا اس درویش میں اس غیر تصحیح شدہ نسخہ سے پڑھانے کی صلاحیت نہیں ہے اور غصہ سے شیخ نظام الدین کو دیکھا۔ اب تو شیخ نظام الدین کی حالت خراب ہوگئی پھر شیخ فرید کے صاحبزادے کے ذریعہ معافی ہوئی۔ ۵ در اصل وہ اس خراب نسخہ سے اس لئے پڑھا رہے تھے تا کہ بہتر طریقے سے سمجھا سکیں۔ اور شاگردوں کی تربیت ہوسکے کہ غیر تصحیح شدہ نسخہ کو کس طرح پڑھا جاتا ہے۔ جہاں تک کتابیات کا تعلق تھا تو اس میں صوفیا کی اپنی پسند سمجھ وفکر کو بھی کافی حد تک دخل تھا۔ مثال کے طور پر شیخ بہاء الدین زکریا زنتشری کی کشاف کو نہیں پڑھاتے تھے اس کے برعکس شیخ حمید الدین ناگوری کشاف کے بڑے مداح تھے۔ اور باقاعدہ طور پر اپنے شاگردوں کو پڑھاتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا رضی الدین حسن ناگور گئے تو وہاں ایک شخص نے انہیں تصوف پر

درس دیئے کو کہا تو انہوں نے یہ کہہ کر معافی مانگ لی کہ آج کل میں ناکور میں حدیث کا درس دے رہا ہوں۔ اگر تم تصوف پر درس لینا چاہتے ہو تو جب میں یہاں سے چلوں تو تم میرے ساتھ چلو دوران سفر، میں تمہیں تصوف پر درس دیتا رہوں گا۔[6] دوسری کتابیں جو خانقاہی مدارس میں پڑھائی جاتی تھیں ان میں روح الارواح، قلب القلوب، عوارف المعارف، مرصاد العباد، مکتوبات سلوک مریدین، احیاء العلوم الدین، اربعین، کیمیای سعادت، کشف المحجوب، اخبار نیرین، رسالہ قشیری، لوامع، خمسہ نظامی وغیرہ۔ دہلی میں اس دور میں ان کتابوں کی بڑی مانگ تھی۔ شیخ نظام الدین اولیاء جب دہلی میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد اجودھن گئے تو اس کے کچھ عرصے بعد ان کے دوست کا بھی اجودھن جانا ہوا۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ نظام الدین پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا کہ آپ جیسا عالم یہاں کیا کر رہا ہے۔ آپ جیسے عالم کی ضرورت تو دہلی جیسے شہر میں ہے جہاں آپ کی علمیت کی بھی شہرت ہوگی اور مالی منفعت بھی۔[7] شیخ نظام الدین کو مشارق الانوار پر زبردست عبور تھا۔ جس کے نتیجے میں ان کے شاگرد مولانا شمس الدین یحیٰی نے مشارق الانوار کی تفسیر لکھ دی۔ شیخ نظام الدین کی رائے اربعین کے بارے میں بہتر نہ تھی اور وہ احادیث پر صحیحین کو پڑھنے کی ہدایت فرماتے۔[8] اس لئے کہ مولا علیؑ کا قول ہے کہ جب کوئی حدیث سنو تو اسے عقل کے معیار پر پرکھو صرف نقل الفاظ پر بس مت کرو اس لئے کہ علم کے نقل کرنے والے بہت ہیں اور اس میں غور کرنے والے بہت کم ہیں۔ جب غیاث الدین تغلق (۲۵-۱۳۲۰ء) نے قلعہ تغلق آباد میں سماع کے موضوع پر بحث ومباحثہ رکھا اس میں حضرت نظام الدین اولیاء کو بلایا۔ اس محضر میں دہلی کے تمام جید علماء مدعو تھے۔ بحث کی ابتداء مولانا حسام الدین نے سماع کی رد میں شروع کی۔ بقول برنی حضرت نظام الدین اولیاء نے چند احادیث کا حوالہ دیا تو

بعض علما نے جواباً کہا کہ ہمارے شہر میں روایت فقہ، حدیث پر مقدم ہے ہم ایسی حدیثیں ہرگز نہیں سنیں گے۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے کہا کہ میں نے کسی عالم کو نہیں دیکھا کہ اس کے سامنے حضرت محمدؐ کی صحیح حدیث روایت کی جائیں اور وہ کہے کہ میں سنتا نہیں۔[۹] خانقاہی مدارس میں تربیت پر بھی بڑی سخت توجہ دی جاتی تھی تاکہ وہ شخص تمام تعصّبات سے اوپر اٹھ کر تعلیم کی تکمیل کے بعد عالم باعمل بن کر نکلے۔ کیونکہ خانقاہی مدارس سماج کے تمام طبقات کے لئے کھلے تھے اس لئے یہ مدارس ایک تجربہ گاہ بھی تھے اور جو تجربہ اساتذہ اور طلباء کو یہاں ہوتا تھا وہ سرکاری مدارس میں نہ تھا۔ جیسے میرے مورث اعلیٰ میر سید علی ہمدانی نے جب کشمیر میں اپنی خانقاہ قائم کی تو وہاں کی یوگی للہ دید بھی آئیں اور مختلف مسائل پر بات کرنے کے بعد انہوں نے بھی مورتی پوجا اور ہندو سماج کے طبقاتی نظام کی مخالفت شروع کی۔ اس طرح کے تجربات علماء کے قائم کردہ مدارس میں ممکن نہ تھے۔ دوسرے علماء شہری ثقافت سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے مدارس سلطنت کے بڑے بڑے شہروں میں تھے۔ اس کے برعکس صوفیاء شہر اور قصبات میں کوئی تفریق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ قصبات و دیہات ان کی توجہ خاص کا مرکز ہوتے۔ انہوں نے سلطنت کو اپنی ولایت میں تقسیم کیا اور تمام قصبات میں اپنے خلیفہ بھیجے۔ ان صوفیا نے ان قصبات میں اسلام کی تبلیغ کی، مدارس قائم کئے اور اصلاح سماج کا کام انجام دیا بعض صوفیاء کو ان جگہوں پر جام شہادت بھی نوش کرنا پڑا۔ علماء نے اپنے آپ کو ایسے خطرات سے دور رکھا لیکن ان صوفیاء نے ان قصبات کا ڈھانچہ ہی بدل ڈالا اور ایک اہم تبدیلی ان خانقاہوں کے قیام کے بعد دیکھنے میں آئی۔ محمد بن تغلق (۱۳۲۵-۵۱) کے عہد میں ان مسلمانوں کو سرکاری عہدے ملے جن کا تعلق مسلم سماج کے نچلے طبقات سے تھا۔ علماء نے تو اپنے مدارس کے دروازے ان کے لئے بند کر رکھے تھے تو

پھر ان کی تعلیم کہاں ہوئی۔ ان مسلمانوں کی تعلیم وتربیت خانقاہی مدارس میں ہوئی۔ کل ہم نے دیکھا کہ جب بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت نے نیشنل کاونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے ذریعہ اپنی ہندوتو سمجھ کو تاریخ ہندوستان کا حصہ بنایا تا کہ ان کتابوں کو ہندوستان کے بچوں کو پڑھایا جائے اور ہندوتو کی سمجھ ہندوستانی سماج وثقافت کا حصہ بن سکے تو اس کی بڑی مخالفت ہوئی لیکن ہمارے پاس کوئی متبادل حل نہ تھا۔ اس لئے کہ اسکولی تعلیم پر پورا کنٹرول سرکار کا ہے۔ لیکن یہ مشکل صوفیاء کو تیرہویں صدی عیسوی سے لیکر پندرھویں صدی تک پیش نہیں آئی اس لئے کہ ان کے اپنے مدارس تھے۔ ان کا اپنا نصاب تھا اور سرکاری مدارس تو شہروں تک محدود تھے جبکہ صوفیا کے مدارس تو قصبات تک پہونچ چکے تھے لہذا خانقاہی تعلیمی نظام پورے شمالی ہندوستان پر چھایا ہوا تھا۔ شمالی ہندوستان کے قصبات مثلاً امروہہ، جلالی، سرسی، سنبھل وغیرہ صوفیا کی وجہ سے علمی مراکز بن کر ابھرے۔ کشمیر پنجاب، گجرات، راجستھان بنگال، بہار اور آسام میں صوفیا نے اپنی خانقاہیں قائم کرکے ایک انقلابی کیفیت پیدا کردی۔

لیکن چاہے وہ سرکاری مدارس، علماء کے قائم کردہ یا خانقاہی مدارس ہوں ان کے نصاب میں علوم معقولات برائے نام شامل تھے علمائے معقولین مثلاً ابن سینا اور دوسرے مسلم مفکرین کی کتابیں ان کے نصاب میں شامل نہ تھیں۔ بقول برنی، محمود غزنوی نے کہا تھا کہ ''اگر ابن سینا اسکی سلطنت میں آجائے تو اس کی بوٹی بوٹی علحدہ کرادوں''۔[1] سید مبارک غزنوی نے التمش سے کہا تھا کہ ''تمام فلسفیوں کو دہلی سلطنت کی حدود سے باہر نکال دیا جائے اور ان کی کتابوں کا مطالعہ نہ کیا جائے[1]۔'' شیخ شہاب الدین سہروردی نے کہا تھا کہ ان علمائے معقولین کو کس طرح سمجھایا جائے کہ بس ایک ہی علاج ہے اور وہ ہے قبر۔[2] اب نہ جانے کیوں علماء ومشائخ ایسکورٹس ہارٹ انسٹی ٹیوٹ، اپولو اور آل

انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں قبر کو دور رکھنے کے لئے بائی پاس سرجری کیوں کراتے ہیں اس کی بنیاد بھی تو ابن سینا نے ہی ادویہ قلبیہ لکھ کر ڈالی تھی۔ حد یہ ہوئی کہ فخر الدین رازی نے ابن سینا کی کتابوں کے جواب میں تنقیدی تبصرہ کیا تھا تو بقول شیخ حمید الدین ناگوری مولانا شمس الدین حلوائی نے فخر الدین رازی کی کتابوں کے مطالعہ کی بھی ممانعت کردی تھی۔ در اصل تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے علماء ومشائخ تقلیدی ذہن پیدا کررہے تھے۔ علاء الدین خلجی (۱۲۹۶-۱۳۱۶) کے عہد میں علماء کا اثر کم ہوا تب کہیں جا کر ایک حوالہ ملتا ہے کہ حکیم بدر الدین دمشقی دہلی میں ابن سینا کی کتاب القانون پر درس دیا کرتے تھے۔

۱۳۲۵ء کے بعد سلطنت میں تبدیلیاں آنا شروع ہوئیں اب حضرت نظام الدین اولیاء کا انتقال ہوچکا تھا اور شیخ نصیر الدین چشتی سلسلے کے خلیفہ تھے اور محمد بن تغلق دہلی سلطنت کا سلطان بنا۔ وہ ایک عالم شخص تھا۔ اس کو علوم معقولات میں نہ صرف دلچسپی تھی بلکہ اس کو عبور حاصل تھا جس کی وجہ سے تقلید وتوارث سے متاثر مسلم معاشرے نے اس کے خیالات وفکر کو قبول کرنے سے انکار کردیا اسکی فکر فلسفیانہ جستجو کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی۔ اسکے حلقہ میں علمائے معقولین میں مولانا علیم الدین، ملک سعد الدین اور نجم المختار جیسے مشہور فلاسفہ شامل تھے محمد بن تغلق نے زر کثیر خرچ کرکے مسلم دنیا میں ہونے والی علوم معقولات کی کتابوں کو ہندوستان منگوالیا تھا تاکہ وہ اور دوسرے علماء انکا مطالعہ کریں۔ یہ وہ وقت ہے جب نصیر الدین طوسی کی کتابیں بھی ہندوستان پہونچ چکی تھیں برنی لکھتا ہے" معقولات فلاسفہ نے جو سیاہ قلبی اور سنگ دلی کی بنیاد ہیں اس کے دل میں جڑ پکڑلی ہے۔[۱۳] یہ ہے چودھویں صدی عیسوی کے ایک عالم کی رائے محمد بن تغلق کے بارے میں۔

بقول حضرت سید محمد گیسودراز "سلطان محمد کہا کرتا تھا کہ ابو بکر، عمر، عثمان اور علی نے کیا کیا ہے جو ہم نہیں کر سکتے ہیں۱۳ دراصل یہی محور تھا محمد بن تغلق کی فکر کا۔ یہ بات سنی وشیعہ علماء میں یکساں ہے۔ وہ ان اہل بیت اور صحابہ کی عملی زندگی کو صرف منبر سے اپنی تقریر کی زینت بنانا چاہتے ہیں مثلاً حضرت ابو بکر نے انتقال سے قبل اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ جو تنخواہ انہیں بیت المال سے ملی ہے وہ اس رقم کو واپس کر دیں ۱۵۔ ہمارا تنخواہ واپس کرنا تو درکنار ہم کام بھی صحیح طریقے سے انجام نہیں دیتے تا کہ ہماری وہ تنخواہ حلال روزی کا حصہ ہو جائے۔ حضرت علی مزدوری کرتے تھے لیکن ہم کو مزدوری سے عار ہے۔ حضرت علی جو کی روٹی کھاتے تھے لیکن کوئی شخص یہ ہمت نہیں کر سکتا کہ سوئم یا چالیسویں کی مجلس کے بعد عمدۃ الواعظین اور دوسرے مومنین کو کھانے میں جو کی روٹی پیش کر دے۔ نہیں اب نان، قورمہ اور بریانی چاہیئے۔ بقول مولا علی" وہ علم بے قدر وقیمت ہے جو زبان تک رہ جائے مولا علی فرماتے ہیں جو لوگوں کا پیشوا بنتا ہے اسے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے کو تعلیم دینا چاہئے اور زبان سے درس اخلاق دینے سے پہلے اپنی سیرت وکردار سے تعلیم دینا چاہئے۔ ۱۶ اسی لئے محمد بن تغلق کی بات بری لگی تھی" کہ جو ہم نہیں کر سکتے" مولا علی واقف تھے اپنے دور میں بھی دیکھ رہے تھے اور اکیسویں صدی پر بھی ان کی نظر تھی اسی لئے آپ نے کہا " دیکھو تمہارے امام کی حالت تو یہ ہے کہ اس نے دنیا کے سازوسامان میں سے دو پھٹی پرانی چادروں اور کھانے میں دو روٹیوں پر قناعت کر لی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہ بات تمہارے بس کی نہیں ہے لیکن اتنا تو کرو کہ پرہیزگاری، سعی وکوشش پاکدامنی اور سلامت روی میں میرا ساتھ دو"۔ ۱۷

اس طرح سے محمد بن تغلق کی سمجھ وفکر علماء ومشائخ سے مختلف تھی۔ پروفیسر خلیق

احمد نظامی کی رائے ہے کہ "محمد بن تغلق غالباً انہیں حالات سے متاثر ہوا تھا۔ اس نے صوفیاء کے تصور ولایت کے خاتمہ اور خانقاہی نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے اپنے دور میں جو کوششیں کیں وہ امام ابن تیمیہ کی تحریک اور تصورات سے بہت مشابہت رکھتی تھیں" میں اپنے استاد محترم کی رائے سے اسلئے متفق نہیں کہ محمد بن تغلق اپنی زندگی کے ہر دور میں صوفیاء کے قریب رہا۔ اس کو حضرت نظام الدین اولیاء سے عقیدت تھی۔ اس نے صوفیاء کے لئے خانقاہیں اور ان کے انتقال کے بعد مقبرے تعمیر کرائے اس کو شیخ شرف الدین یحیٰ منیری اور شیخ شرف الدین پانی پتی سے بڑی عقیدت تھی۔۱۸ اگر وہ صوفیاء کا مخالف ہوتا تو صوفیاء کو دیوگیر نہ بھیجتا تا کہ خانقاہی نظام دکن نہ پہونچتا۔ آج دکن میں صوفیا کا جو اثر ہے وہ بھی محمد بن تغلق ہی کے پلان کا نتیجہ ہے وہ تو دیوگیر میں صوفیا کے تعاون کا خواہاں تھا۔

محمد بن تغلق کیونکہ ایک عالم تھا اس لئے اس نے سوچا کہ شمالی ہندوستان میں اسلامی ثقافتی زندگی کی جڑیں کافی مضبوط ہوچکی ہیں لیکن جنوبی ہندوستان ابھی بھی اس کی توجہ کا طالب ہے۔ جنوب میں صرف فوجی چھاؤنیاں تھیں اور ان امراء اور فوجی سپاہیوں کا، قلعوں میں زندگی گذار رہے تھے، تعلق عوام سے نہ تھا مثال کے طور پر بلبن نے جلالی میں قلعہ تعمیر کرایا جبکہ جلالی اس وقت تک اسلامی تہذیب وثقافت کا مرکز نہ بن سکا جب تک کہ شاہ ہمدان کے پوتے میر کمال الدین ہمدانی نے جلالی کو کبرویہ سلسلہ کا مرکز نہ بنایا۔۱۹ لہٰذا محمد بن تغلق نے چودھویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں لاشمال ولاجنوب کا نعرہ دیا۔ لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اسے علماء ومشائخ کی مدد درکار تھی۔ بغیر ان کے تعاون کے وہ اپنے اس پروگرام کو کامیاب نہیں بنا سکتا تھا۔ شمالی ہندوستان میں بھی یہ کام صوفیاء نے ہی انجام دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ یہی علماء ومشائخ

سمرقند، بخارا، ہمدان شوشتر و دمشق سے ہندوستان آئے اور ہندوستان کے مختلف قصبات میں اپنی خانقاہیں قائم کیں۔ دہلی میں ان علماء و مشائخ کو آباد ہوئے زیادہ سے زیادہ ایک سو ستر سال ہوئے تھے۔ اب دیوگیر جانے کا مسئلہ تھا۔ محمد بن تغلق نے دیوگیر میں مساجد، خانقاہیں اور مکانات تعمیر کرائے تاکہ علماء و صوفیا اطمینان سے وہاں رہ سکیں۔ اسی لئے محمد بن تغلق نے مولانا شمس الدین یحییٰ سے کہا تھا کہ "تجھ جیسا عالم دہلی میں کیا کر رہا ہے تو کشمیر جا اور اسی دیار کے بت خانوں میں بیٹھ اور خلق خدا کو اسلام کی دعوت دے''۔ ؎ محمد بن تغلق کو کشمیر کے سماجی حالات کا علم تھا اور اسلام کی تبلیغ کا خیال تھا یہ کام چشتی صوفیاء تو نہ کر سکے لیکن میر سید علی ہمدانی چودھویں صدی کے آخر میں ہمدان سے کشمیر آئے اور اسلام کی تبلیغ کشمیر میں کی اور بہت کم عرصے میں کشمیر کا مذہبی و سماجی ڈھانچہ ہی بدل ڈالا۔ علماء و صوفیا ۱۳۲۷ء میں دیوگیر گئے۔ لیکن بادل ناخواستہ۔ برنی عصامی اور ابن بطوطہ محمد بن تغلق کے پلان کے بڑے شاکی ہیں۔ معاصرین اور جدید مورخین عہد وسطی نے تو محمد بن تغلق کے اس پلان کو تبدیلی دار السلطنت قرار دے کر اس کے لئے فرد جرم قرار دے ڈالا۔ اور آج اکیسویں صدی میں بھی زیادہ تر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ محمد بن تغلق کے اس پلان کو تبدیلی دار السلطنت ہی پڑھا رہے ہیں اور اس طرح یہ غلط سمجھ ہی طلباء و طالبات تک پہونچ رہی ہے۔ برنی اور ابن بطوطہ جو لکھ رہے ہیں کہ پوری دلّی خالی ہوگئی لیکن خود اسی دلی میں ہی رہتے رہے۔

آج جنوب میں جو اسلام، مسلم تہذیب و ثقافت دیکھنے کو ملتی ہے وہ محمد بن تغلق ہی کے اس پلان کا نتیجہ ہے۔ صوفیاء نے دکن میں مدارس قائم کئے اور تعلیم و ترقی کی تحریک شروع ہوئی۔ آج جو گلبرگہ میں ہمیں میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج دیکھنے کو مل رہے ہیں یہ افتخار اجمیر یا دہلی کو حاصل نہ ہو سکا۔ گلبرگہ کی درگاہ کے سجادہ نشین جناب

سید شاہ محمد محمد الحسینی کے تعلیمی کارناموں سے متاثر ہوکر حکومت ہند نے صدر جمہوریہ ہند کے دست مبارک سے ۳۰ / جون ۲۰۰۴ء کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا۔ وہ گلبرگہ سے اس اعزاز کو حاصل کرنے دہلی آئے ۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ سب محمد بن تغلق کے اس وژن کا نتیجہ ہے جس کا خواب اس نے چودھویں صدی عیسوی میں دیکھا تھا میں نے یہ مضمون اس دعوت نامہ کے نتیجے میں لکھا ہے جو خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے جناب سید شاہ محمد الحسینی کے پدم شری کے اعزاز سے نوازے جانے کے سلسلے میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ بدقسمتی سے اس دعوت میں تو شریک نہ ہوسکا لیکن یہ مضمون لکھ دیا۔ اپنی بات ضیاء الدین برنی کے اس قول پر ختم کروں گا ۔ ''دیوگیر جو کفرستان تھا۔ اسکے چاروں طرف مسلمانوں کے قبرستان بن گئے ۔''[۴] میری سمجھ کے مطابق یہی قبرستان دیوگیر کیا پورے جنوبی ہندوستان کو مسلم تہذیب وثقافت کے خیابان میں تبدیل ہونے کا ذریعہ بنے۔

حوالے:

۱۔نہج البلاغہ۔مترجم جعفر حسین بمبئی، ۱۹۸۸، صفحہ ۸۳۲

۲۔نہج البلاغہ۔مترجم جعفر حسین بمبئی، ۱۹۸۸، صفحہ ۶۹۴

۳۔نہج البلاغہ۔مترجم جعفر حسین بمبئی، ۱۹۸۸، صفحہ ۶۹۴

۴۔ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی صفحات ۳۶، ۴۵

۵۔فوائد الفواد ۲۶۔۲۷ سیر الاولیاء صفحہ ۲۳۹

۶۔سیر العارفین ۔صفحہ ۱۰۳

۷۔سیر الاولیاء صفحہ ۲۳۹

۸۔فوائد الفواد صفحہ ۱۲۲

۹۔سیر الاولیاء صفحہ ۱ ۵۳
۱۰۔صحیفہ نعت محمدی صفحہ ۱۲
۱۱۔برنی صفحہ ۹۸
۱۲۔عبد القادر بدایونی منتخب التواریخ صفحہ ۵۲ جلد سوم
۱۳۔برنی صفحہ ۳۶۵
۱۴۔جوامع الکلم۔صفحات ۱۷۶، ۱۷۵
۱۵۔ابو الاعلیٰ مودودی خلافت وملوکیت۔صفحہ ۱۳۱
۱۶۔نہج البلاغہ:صفحہ، ۸۳۰، ۸۴۴
۱۷۔ایضاً صفحہ ۲۲۷
۱۸۔معدن المعانی صفحہ ۳۷۱
۱۹۔حکیم سید محمد کمال الدین حسین۔اشجار الکمال۔صفحہ ۴۳۔۴۶
۲۰۔سیر الاولیاء۔صفحہ ۲۸۸
۲۱۔برنی۔صفحہ ۳۷۴

☆☆☆☆☆

شعر و ادب:

ڈاکٹر جبار علی انصاری

ہندوستان کی فارسی شاعری

ایک سرسری جائزہ

ہندوستان اور ایران کے ثقافتی تعلقات ہزاروں سال پرانے ہیں۔ آج سے تقریباً ۵ ہزار سال پہلے ان دونوں ملکوں میں ایک ہی نسل کے لوگوں نے آباد ہونا شروع کیا، جن کی مادری زبان بھی اول اول ایک ہی تھی۔ لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان دونوں ممالک میں نئی قوم جو آریائی قوم کے نام سے متعارف ہے، کے طرز معاشرت اور زبان میں فرق پیدا ہونا شروع ہوا۔ ایران میں بسنے والے آریوں کی زبان اوستا اور پہلوی کی شکل میں رائج ہوئی اور سرزمین ہندوستان میں آباد آریائی قوم کی زبان سنسکرت کہلائی۔ ابتدائی دور میں ان دونوں زبانوں میں کافی مماثلت تھی، لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تبدیلیاں آتی گئیں۔ پھر بھی ان دونوں زبانوں میں ایک ایسی مماثلت برقرار رہی جو ان کے ایک ہی خاندان کی ہونے کی غمازی کرتی ہے۔

ایران میں اسلام کی ترویج واشاعت کے بعد ایسے حالات بہم ہوگئے کہ سنسکرت زبان کی بہن فارسی کو ایک مرتبہ پھر اپنی بہن سنسکرت سے ملنے کا موقع ملا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سامانی عہد میں جب اہل ایران مسلمان ہوچکے تھے اور فارسی زبان کا احیاء بھی ہوچکا تھا تو ان فارسی بولنے والے مسلمانوں نے اپنی سلطنت کو وسیع کرنا چاہا۔ چنانچہ اسی سامانی خاندان کے ایک غلام الپتگین کے غلام سبکتگین نے ایک ایسے علاقہ پر اپنی حکومت قائم کرلی تھی، جو موجودہ افغانستان اور برصغیر ہند کے بھی کچھ حصے پر مشتمل تھا۔ سبکتگین کے بعد اس کے

بیٹے محمود غزنوی نے باقاعدہ ہندوستان پر فوج کشی کی اور پنجاب کے کچھ حصوں کو اپنی حکومت میں ملا لیا۔ سبکتگین اور محمود کی انہیں فوج کشی کی وجہ سے سنسکرت کی توام زبان فارسی کو ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کا موقع ملا۔ سلطنت غزنویہ کے ابتدائی دور میں ہی خود سرزمین ہند میں ایسے فارسی کے علماء اور شاعر پیدا ہونا شروع ہوگئے، جنہوں نے اپنی اہمیت کو اہل ایران سے بھی تسلیم کروالیا۔

فارسی شاعری کے حالات پر مبنی سب سے پہلے لکھے جانے والے تذکرہ ''لباب الباب'' سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم بن مسعود غزنوی کے دور میں ہی ہندوستان میں فارسی شاعری کی ابتدا ہوگئی تھی۔ اس عہد کے جن شاعروں کا تذکرہ لباب الالباب میں کیا گیا ہے ان میں تکتی کا نام سرفہرست ہے عوفی کے بقول تکتی سلطان مسعودی بن ابراہیم بن مسعود کے عہد کا ایک شاعر تھا جس کا نام ابو عبد اللہ اور وطن لاہور تھا۔ غزنوی دور کا ایک دوسرا شاعر ابو الفرج رونی تھا جو جالندھر کے قریب ایک گاؤں ''رون'' کا باشندہ تھا۔ یہ شاعر بھی ابراہیم بن مسعود اور مسعود بن ابراہیم بن مسعود کے عہد کا شاعر ہے۔ جس کا انتقال ۱۰۹۴ھ میں ہوا۔ ابو الفرج کا شمار ہندوستانی فارسی کے قدیم ترین قصیدہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ ایران کا ایک عظیم ترین قصیدہ نگار انوری اس کے سبک سے متاثر تھا۔ ابوالفرج کا ایک دوسرا معاصر مسعود سعد سلمان تھا جس کا وطن لاہور تھا۔ مسعود کا شمار بھی ان شاعروں میں ہے جس کے قصیدوں کے ایران کے عظیم ترین شاعر معترف تھے۔

سلطنت دہلی کے قیام (۱۲۰۵ء) کے بعد فارسی ادب اور شاعری کی جڑیں ہندوستان کی سرزمین میں اور گہری ہوگئیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکستان موجودہ افغانستان اور ایران جو علم وادب کے گہوارہ تھے اور منگولوں کے ظلم وبربریت کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ ان علاقوں کے علماء وشعراء کے لئے اگر کوئی جائے پناہ تھی تو صرف سرزمین ہندوستان تھی۔ چنانچہ ضیاء الدین برنی کے قول کے مطابق اس دور میں بے شمار فارسی زبان کے علماء وشعراء ترکستان اور ایران سے

یہاں آکر پناہ گزیں ہوگئے۔ اس عہد کے شاعروں میں پہلا نام ناصری کا ملتا ہے جس نے چنگیزی حملے کے زمانے میں اپنے وطن کو خیرباد کہہ کر التمش کے ہندوستان میں پناہ لی۔ اور اس بادشاہ کی داد و دہش سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اسی عہد کا دوسرا شاعر روحانی سمرقندی ہے وہ بھی ہندوستان میں آنے کے بعد التمش ہی کے دربار سے وابستہ رہا۔ اور اسی عہد کا ایک تیسرا شاعر تاج الدین ریزہ ہوا ہے اور جس کی شاعری کو سلطان التمش اور اس کے بیٹے رکن الدین کے عہد میں عروج حاصل ہوا۔ اسی عہد کا ایک اور شاعر شہاب الدین مہمرہ ہے جس کا تعلق رکن الدین فیروز کے دربار سے رہا ہے۔ اور حضرت امیر خسرو کے بیان کے مطابق اس کا وطن بدایوں تھا کہا جاتا ہے کہ امیر خسرو نے شہاب الدین مہمرہ سے فن شعر میں کمال حاصل کیا تھا۔

سلطنت دہلی کے قیام کا ابتدائی دور صرف متذکرہ فارسی گو شعراء کا دور نہ تھا بلکہ اس دور میں فارسی کی نثری تصانیف بھی اس ملک میں وجود میں آئیں۔ عہد غزنوی کے آخری دور میں یعنی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں تصوف کے موضوع پر زبان فارسی میں تحریر کی جانے والی پہلی کتاب کشف المحجوب تھی۔ التمش کے دور میں ہندوستان میں فارسی کی دوسری اہم کتاب بھی فارسی شعراء کا پہلا تذکرہ "لباب الالباب ۱۲۲۱ء میں تصنیف ہوا اور اسی تذکرہ کے مصنف عوفی نے اسی زمانے میں اپنی مشہور دوسری خالص ادبی تصنیف جوامع الحکایات' دنیا کے سامنے پیش کی۔ ہندوستان میں فارسی تاریخ نویسی کی ابتداء بھی اسی دور میں ہوئی۔ اور ۶۵۸ھ مطابق ۱۲۶۰ء میں ہندوستان میں عہد غزنوی کی اہم ترین تاریخ طبقات ناصری لکھی گئی۔

متذکرہ تمام شاعروں کے علاوہ یہی وہ دور ہے جس میں ہندوستان کا عظیم ترین فارسی شاعر امیر خسرو پیدا ہوا۔ جس نے نہ صرف اپنی پدری زبان یعنی فارسی اور اپنی مادری زبان یعنی ہندی میں انتہائی اعلیٰ پیمانے پر شاعری کی بلکہ اسی نے ہندوستانی اور ایرانی تہذیب کو ایک دوسرے سے قریب کرنے میں بھی بہت اہم حصہ لیا۔ امیر خسرو کے والد بھی چنگیزی

حملہ میں ماوراالنہر سے ہندوستان آگئے تھے اور یہاں آنے کے بعد انہوں نے ایک خالص ہندی النسل امیر عماد الملک کی بیٹی سے شادی کی جس کے نتیجہ میں ۱۲۵۳ء میں موجودہ ضلع ایٹہ کے ایک گاؤں پٹیالی میں خسرو پیدا ہوئے۔ خسرو نے ہندوستانی فارسی ادب کو گوہر سخن سے مالامال کیا انہوں نے اعلیٰ پایہ کی غزلیں کہیں۔ شاندار مثنویاں لکھیں اور خزائن الفتوح جیسی اہم تاریخی معلومات پر مشتمل کتاب کا فارسی ادب میں اضافہ کیا۔

خسرو کے ایک معاصر حسن دہلوی (پیدائش ۱۲۵۴ء) بھی اعلیٰ پایہ کے فارسی غزل گو تھے۔ لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کی تصنیف فوائد الفواد ہے۔ ان دو عظیم شاعروں کے علاوہ بدر چاچ اور مسعود یک بھی دور تغلق کے بڑے شاعر ہوئے ہیں۔ جن میں اوّل الذکر مشہور قصیدہ نگار تھا اور ثانی الذکر شاعی خاندان کا ایک فرد ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم صوفی شاعر بھی تھا۔

امیر خسرو اور حسن دہلوی کا عہد تغلق خاندان کے دور حکومت تک پھیلا ہوا ہے۔ تغلق خاندان کے آخری زمانے سے فارسی ادب کی ترقی میں جمود پیدا ہوگیا اور کافی عرصے تک اس ملک میں امیر خسرو اور حسن دہلوی کے مقابلہ کا دوسرا شاعر پیدا نہیں ہوسکا۔ لیکن پھر بھی ہمیں خاندان مغلیہ کی بنیاد پڑنے کے پہلے کچھ اہم فارسی شاعروں کا پتہ چل ہی جاتا ہے۔ جن میں شیخ جمال، جولودی عہد کے شاعر ہیں، کا نام سرفہرست ہے۔

ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد پڑنے کے بعد ہندوستانی فارسی ادب میں اہم پیش رفت ہوئی۔ یہ دور وہ تھا جب ایران میں صفوی سلطنت قائم ہوچکی تھی اور ابتدائی صفوی بادشاہوں کی عصبیت اور تنگ نظری کی وجہ سے ایران میں سوائے مذہبی ادب کے اور کسی دوسرے ادب کی گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ اس کے برخلاف ہندوستان میں یہ وہ دور تھا جب اکبر کی وسیع المشربی کی وجہ سے ہر شخص کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ساتھ ساتھ عہد اکبری ہندوستان کا فارسی زبان کا عہد زریں بھی تھا۔ خود شاہان دہلی کے علاوہ انکے امراء بھی علم

وادب کے زبردست سرپرست تھے، جن کی داد ودہش ممالک غیر سے اہل علم کو ہندوستان کھینچ لارہی تھی اور اس زمانے میں ہمیں ایسے سینکڑوں واقعات ملتے ہیں جب اہل علم اور شعراء کو سونے میں تلوالیا گیا یا ان کے منھ کو موتیوں سے بھرا گیا۔ اس عہد میں شعرو ادب کی یہ سرپرستی صرف دربار مغلیہ تک ہی محدود نہ تھی بلکہ جنوب کی ریاستوں کے سربراہ بھی اس داد ودہش میں مغل امراء کے شانہ بشانہ چل رہے تھے۔ ایرانی حکمرانوں کی تنگ نظری اور ہندوستان کے امراء وحکمرانوں کے اس وسیع النظری اور علمی سرپرستی کا ایک اثر یہ ہوا کہ ایران کے وہ تمام علماء اور شعراء جو اپنے کو صرف مذہبیات تک محدود کرنے کے حق میں نہ تھے، ایران چھوڑ کر خشکی اور سمندری راستوں سے شمالی اور جنوبی ہندوستان میں آنے لگے۔ ہندوستانی امراء اور سلاطین کی داد ودہش کا حال اس دور میں لکھے جانے والے تذکروں میں شرح وبسط کے ساتھ ملتا ہے۔ چنانچہ عبدالنبی فخر الزمانی اپنے تذکرہ ''میخانہ'' میں لکھتے ہیں کہ۔

''میر مغیث محوی جب ہندوستان سے گئے تو یہاں کی داد ودہش کا حال انہوں نے اس انداز سے پیش کیا کہ جو کوئی بھی اسے سنتا تھا خود وہاں جانے کے لئے بے چین ہوجاتا تھا۔''

ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایران درجہ اول کے شاعروں اور غیر مذہبی علوم کے عالموں سے خالی ہوگیا۔ اور ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کثرت ہوگئی۔ اس عہد میں فارسی زبان کے عظیم ترین شاعر مثلاً عرفی شیرازی ابو طالب کلیم، طالب آملی۔ قدسی مشہدی، علی قلی سلیم، بابا طالب یہ سب ہمیں ہندوستان میں نظر آتے ہیں، حد یہ ہے کہ جب ایرانی تنگ نظری میں کچھ کمی آئی تو اس وقت کے شاعر بھی ہندوستان آنے سے اپنے کو نہ روک سکے۔ چنانچہ یہ صائب تبریزی ایران میں ملک الشعراء ہونے کے باوجود ہندوستان آیا۔ اس دور میں نہ صرف ایرانی شاعر ہندوستان بلکہ ہندوستان نے خود بہت سے عظیم شاعر پیدا کئے، جن میں ابو الفضل فیضی ملا شیدا، چندر بھان برہمن ناصر علی سرہندی، ملا طاہر غنی کشمیری، اور بیدل عظیم آبادی کے نام سرفہرست ہیں۔ عہد مغلیہ کے اس نصف اول (۱۵۲۶ء تا ۱۷۰۷ء) میں صرف فارسی شاعری

ی کو عروج نہیں حاصل ہوا بلکہ نثر میں بھی کچھ بہت اہم کتابیں تصنیف ہوئیں۔ اس دور میں طبقات اکبری، اکبرنامہ، منتخب التواریخ، بادشاہ نامہ، تاریخ الفی، منتخب اللباب جیسی اہم تاریخی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ فارسی شعراء کے اہم ترین تذکرے۔ مثلاً ہفت اقلیم، عرفات العاشقین، نظم گزیدہ، مآثر رحیمی، مآثر جہانگیری، خلاصۃ الاشعار، جیسے تذکرے لکھے گئے۔ اور اسی دور میں ہندوستان کی اہم ترین کتابوں جیسے اپنیشد، مہابھارت، بھگوت گیتا اور رامائن وغیرہ کے فارسی ترجمے ہوئے اس زمانے میں خالص ادبی کتابیں بھی تصنیف ہوئی ہیں جن میں سرفہرست عیار دانش ہے جو حقیقتاً انوار سہیلی کی ایک آسان شکل ہے۔

ہندوستان میں فارسی زبان جبر وتشدد سے رائج نہیں ہوئی تھی اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کی بعد جب مسلمانوں کا اقتدار اس ملک سے ختم ہونے لگا تو اسی زمانے میں فارسی زبان نے غیر مسلموں میں انتہائی مقبولیت حاصل کرلی۔ اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ہندوستان میں فارسی ہندو عالموں کی تعداد مسلمان عالموں سے کم نہ تھی۔ اس دور میں اگرچہ ایک طرف سراج الدین علی خان آرزو جیسے فارسی زبان کے عظیم محقق پیدا ہوئے تو اسی کے ساتھ ساتھ ٹیک چند بہار جیسے ہندو مستند عالم اور محقق بھی ہوئے۔ اس دور میں اگر سراج الدین آرزو، غلام علی آزاد بلگرامی جیسے مسلمان عظیم تذکرے نگار پیدا ہوئے تو بندرابن خوشگو، لچھمی نرائن شفیق بھگوان داس ہندی جیسے عظیم ہندو تذکرہ نگاروں نے بھی اپنا لوہا منوالیا۔ فارسی کے ان ہندو اور مسلمان عالموں کی سرپرستی صرف اسلامی درباروں تک محدود نہ تھی۔ ہندو درباروں میں بھی ان کی دل کھول کر ہمت افزائی کی جاتی تھی اس دور میں فارسی کی مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسلمان ریاستوں کے علاوہ سکھ، مرہٹہ اور جاٹ ریاستوں میں بھی فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔

انیسویں صدی عیسوی کا اختتام ہندوستان میں فارسی کے زوال کا دور ہے۔ اس دور میں فارسی کی جگہ ہندوستان میں ابھرتی ہوئی ایک دوسری زبان اردو نے لے لی تھی۔ یہ دور وہ

تھا جس میں فارسی بولی جانے والی زبان نہ رہی لیکن اس زمانے میں بھی وہ ایک علمی زبان کی حیثیت سے برقرار تھی۔ اور ہندوستان کے کائستھ، کشمیری برہمن اور کچھ مسلمان فارسی کی خدمت میں منہمک تھے۔ اس عہد میں بھی ہمیں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتؔ جیسے مسلمان اور مرزا ہرگوپال تفتہؔ جیسے ہندو شاعر فارسی شاعری کا علم بلند کیے ہوئے نظر آتے ہیں۔ البتہ اس دور کے بعد ایسے فارسی گو شاعروں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ بالکل ہی نہ رہی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر میں بھی ہمیں نامیؔ جالندھری جیسے شاعر نظر آجاتے ہیں۔

بیسویں صدی کا ابتدائی دور عہد اقبال ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہندوستان کا یہ سب سے عظیم شاعر جس کے اثرات پوری فارسی دنیا پر پھیل چکے ہیں اسی دور میں پیدا ہوا اور ابھرا، جب فارسی ملک میں اپنے آخری دن پورے کررہی تھی۔ اقبالؔ کا وصال ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ اور ایسا نظر آنے لگا کہ شاید ان کے بعد ہندوستان فارسی کو شعراء سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بالکل خلاف توقع ۱۹۸۷ء میں فارسی کلام پر مشتمل ڈاکٹر محمد ولی الحق انصاری فرنگی محل لکھنؤ کا مجموعہ شعلہ ادراک کے نام سے ہمارے سامنے آیا جس کو دیکھ کو احمد منزوی جیسے فارسی عالم کو بھی "ہنوز زبان فارسی در ہندوستان بایں انداز زندہ است" کہنا پڑا۔

ماخذات

۱۔ تاریخ ادبیات ایران ذبیح اللہ صفا

۲۔ شعر العجم شبلی نعمانی

۳۔ رود کوثر شیخ محمد اکرم

۴۔ جدید فارسی شاعری۔ غیب الرحمٰن

۵۔شعر العجم فی الہند۔ اکرام الحق
۶۔صنا دید عجم۔مہدی حسن ناصرہ
۷۔شعرائے نامور۔ڈاکٹر ایم ایم جلالی
۸۔سرگذشت پیر ہرات۔لوئی ماسینیون
۹۔تاریخ ادبیات ایران مترجم رفعت سید مبارز الدین
۱۰۔شعلہ ادراک۔محمد ولی الحق انصاری
۱۱۔تذکرہ حفاظ۔ ذہبی
۱۲۔خسرو شناسی۔ ظ۔ انصاری

☆☆☆☆☆☆☆

معجز سنبھلی

امام عصر سے

خلوت نشیں ہے پردۂ غیبت تیرے بغیر
دنیا پہ آرہی ہے اک آفت تیرے بغیر

طوفان میں ہے کشتی ملت تیرے بغیر
تکتا ہے ایک ایک کی صورت تیرے بغیر

گر آرہی ہے ساتھ قیامت تو فکر کیا
یوں بھی تو ہورہی قیامت تیر بغیر

یوں بھی قدم قدم پہ ہے خطروں کا سامنا
یوں بھی تو حادثوں کی ہے کثرت تیرے بغیر

یوں بھی تو ہو رہی ہیں گریباں کی دھجیاں
یوں بھی ہے چاک دامن غیرت تیرے بغیر

بڑھتا ہی جارہا ہے زمانہ کا اضطراب
کوئی نہیں سکون کی صورت تیرے بغیر

ظلمت بدوش آج ہے ہر گوشہ جہاں
اے آفتاب برج رسالت تیرے بغیر

محسوس ہورہا ہے نہ بدلے گی اب کبھی
دنیا کے انتشار کی حالت تیرے بغیر

ہے کشمکش کا دور الٹ دے نقاب کو
وجہ سکوں نہیں کوئی ساعت تیرے بغیر

معجزؔ سے پرگناہ کی میدان حشر میں
کوئی نہ کرسکے گا ضمانت تیرے بغیر

کیفی سنبھلی

منقبت

جو عہد آئے ہیں کر کے سر الست علیؑ
تمام خلق کا رکھتے ہیں بندوبست علیؑ

بلندیوں پہ کھڑے آپ ہوتے رہے گا
نہ کل تھے پست علیؑ اور نہ اب ہیں پست علیؑ

کسی حسینؑ کی آمد کا انتظار لئے
کھڑے ہیں آج بھی کرب و بلا بدست علیؑ

بدن سے کھینچ لو پیکاں کہ قتل کر ڈالو
مگے رضائے خداوند میں ہیں مست علیؑ

بھٹک کے ان سے جہالت کی موت مرنا ہے
عقیدتوں کے جہاں کی ہیں بود و ہست علیؑ

تلاش کرتے ہو کیوں مجمع صحابہ میں
ہے جبرئیلؑ کا رضوان کا ہم نشست علی

ہم اپنے سجدوں پہ نازاں نہیں ہیں اے کیفیؔ
بروز حشر ہمارے ہیں سرپرست علی

☆☆☆☆☆

درمدح حضرت علی

انیس احمد خاں انیسؔ بنی دہلی

دیوار کعبہ درہوئی یہ واقعہ بھی دیکھ
تاریخ دیکھ دین کی جغرافیہ بھی دیکھ

ہجرت کی رات کا تو ذرا واقعہ بھی دیکھ
خیرالوریٰ بھی نائب خیرالوریٰ بھی دیکھ

راہِ اسلام

درمدح حضرت علی

انیس احمد خاں انیسؔ بنی دہلی

دیوار کعبہ درہوئی یہ واقعہ بھی دیکھ
تاریخ دیکھ دین کی جغرافیہ بھی دیکھ

ہجرت کی رات کا تو ذرا واقعہ بھی دیکھ
خیرالوریٰ بھی نائب خیرالوریٰ بھی دیکھ

علیؑ علیؑ

ذکی فہیم اور علیم ودیدہ ور علی علی
ہیں شہرِ درس وعلم کا عظیم در علیؑ علیؑ

☆☆☆

رہ حیات میں ہو وردِ معتبر علیؑ علیؑ
بہ ہر قدم صدا رہے یہ ہم سفر علیؑ علیؑ

☆☆☆

ہر ایک شرک وکفر کی سیاہ شب کا خاتمہ
نقیب نور نعرہ زن دم سحر ، علیؑ علیؑ

☆☆☆

جہاں اہل بیت میں نبیؐ کی پاک بیٹیاں
روش روش چمن ، شجر شجر علیؑ علیؑ

☆☆☆

یداللہ آپ ہیں ، بساط خیبری ہے کیا !
بڑی مہم ہو کتنی بھی، ہو پل میں سر، علیؑ علیؑ

☆☆☆

برائے رد مشکلات و غم ، بفضل لم یزل
ہے اسم پاک پر جلال و پر اثر علیؑ علیؑ

☆☆☆

سخن سخن زباں زباں نظر نظر بیاں بیاں
ہے خوب منقبت بگر پس ہنر علیؑ علیؑ

☆☆☆

منقبت در مدح حضرت علی علیہ السلام

کس کا کعبہ میں پسر کس کا برادر آیا
دین نے بڑھ کے کہا میرا مقدر آیا

بوترابی تکبرِ غیض و غضب کیا کہیے
سامنے سر کو جھکائے درِ خیبر آیا

چاہے ہجرت ہو کہ نصرت ہو پیمبرؐ کے لئے
کام آیا تو فقط نفسِ پیمبر آیا

اوروں کا ذکر تو اک دفترِ بے معنی ہے
خود پیمبرؐ نے کہا فاتحِ خیبر آیا

کعبہ کا [illegible] بنت اسد کیا آگئیں
خیر مقدم کے لئے [illegible] در آیا

بزمِ سلام

برائے رد مشکلات و غم ، بفضل لم یزل
ہے اسم پاک پر جلال و پر اثر علیؑ علیؑ

☆☆☆

سخن سخن زباں زباں نظر نظر بیاں بیاں
ہے خوب منقبت بگر پس ہنر علیؑ علیؑ

☆☆☆

منقبت در مدح حضرت علی علیہ السلام

کس کا کعبہ میں پسر کس کا برادر آیا
دین نے بڑھ کے کہا میرا مقدر آیا

بوترابی تکبرِ غیض و غضب کیا کہیے
سامنے سر کو جھکائے درِ خیبر آیا

چاہے ہجرت ہو کہ نصرت ہو پیمبرؐ کے لئے
کام آیا تو فقط نفسِ پیمبر آیا

اوروں کا ذکر تو اک دفترِ بے معنی ہے
خود پیمبرؐ نے کہا فاتحِ خیبر آیا

کعبہ کا [illegible] بنت اسد کیا آگئیں
خیر مقدم کے لئے [illegible] در آیا

رضاؔ امروہوی

کیا یہ انصاف کی معراج ہے دنیا والو
مجھ کو ناکردہ گناہوں کی سزا دی اس نے
موت کے منہ پہ تبسم کے چلائے نشتر
آگ پانی میں بہرحال لگادی اس نے
حق پرستوں کے سروں کی ہے نمائش آؤ
شہر میں آج کرائی ہے منادی اس نے

☆☆☆☆

قصیدہ

(در مدح سید الساجدین حضرت امام زین العابدینؑ)

منبع جود وسخاوت مرکز علم ویقین
محور صبر و قناعت ، مصدر احکام دیں !
مظہر فہم فراست ، مرجع مستضعفین !
''آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں''

(۲)

آپ کا روئے مبارک مصحف انوار حق !
چشمہ ہائے بابصیرت معدن اسرار حق !
مطلع نور ہدایت آپ کی لوح جبیں !

"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۳)

ہر نفس جاں بخش مثلِ یاسمین و نسترن
نکہتِ باغِ عدن لاریب ، خوشبوئے دہن
نافۂ مشکِ ختن حضرت کی زلفِ عنبریں !
"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۴)

آپ کے دادا علیؓ کل اولیاء کے تاجدار
آپ کے نانا تھے شاہانِ عجم میں نامدار
آپ نے ورثے میں پائی عزتِ دنیا و دیں !
"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۵)

راہ اسلام

"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۳)

ہر نفس جاں بخش مثلِ یاسمین و نسترن
نکہتِ باغِ عدن لاریب ، خوشبوئے دہن
نافۂ مشکِ ختن حضرت کی زلفِ عنبریں !
"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۴)

آپ کے دادا علیؓ کل اولیاء کے تاجدار
آپ کے نانا تھے شاہانِ عجم میں نامدار
آپ نے ورثے میں پائی عزتِ دنیا و دیں !
"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۵)

(۷)

عہد میں حجاج کے تعمیر جب کعبہ ہوا
سنگ اسود کو کسی صورت قرار آتا نہ تھا
اس نے جب تک دست بوسی کا شرف پایا نہیں !
''آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں''

(۸)

آپ کی تکبیر ، تکبیر رسول کبریا؟
آپ کی تسبیح ہمشان جناب سیدہؑ
آپ کی تعقیب ، تعقیب امیر المومنینؑ !
''آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں''

(۹)

وہ تضرع اور زاری آپ کا وقت قیام !
لرزہ بر اندام دست وپا وہ مثل بید خام !
وہ گلو گیری تلاوت میں لحن دلنشیں !
''آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں''

(۱۰)

آپ کا سجدۂ عیاں جس سے مقام عبدیت
آپ کا سجدۂ کہ ہے وجہ دوام عبدیت
آپ کے سجدے کا چرچا بر سر عرش بریں !
''آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں''

(۱۱)

وہ تہجد میں خدا سے آپ کا رازو نیاز !
وہ خشیت وہ رجوع قلب دوراں نماز !
معترف ہیں جس کے سب اہل فلک اہل زمیں !
"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۱۲)

ہے دعاؤں کا جو مجموعہ صحیفہ آپ کا
علم عرفاں کا خزینہ ہے وہ تحفہ آپ کا
ہے بجا اس کو اگر کہیے "ریاض السالکیں" !
"آپ زین العابدیں ہیں، آپ زین العابدیں"

(۱۳)

محفل افلاک میں منظر سنانے کے لئے
حورو غلمان وملک سے داد پانے کے لئے

قلم نے آج کس چادر کے خال وخد ابھارے ہیں
خوشی سے آیۂ تطہیر نے گیسو سنوارے ہیں

یہ چادر وہ ہے جس سے آسماں نے چھاؤں مانگی ہے
اسی چادر کی خاطر خلد نے دامن پسارے ہیں

اسی چادر کے دو پیوند ہیں یہ چاند اور سورج
اسی چادر کے تاروں سے بنے سارے ستارے ہیں

اسی چادر کے سنجیدہ کہکشاں میں نظر آئے
ثوابت اور سیارے اسی کے استعارے ہیں

یہی چادر ہے امواج بلا میں نوح کی کشتی
یہی چادر ہے جس نے دشت میں دریا ابھارے ہیں

اسی چادر سے عزت کا سفر آغاز ہوتا ہے
اسی چادر سے وابستہ شرف سارے ہمارے ہیں

یہی اک دکھیا بیٹی کے لئے غربت کی زینت ہے
اسی نے رنگ اک ٹوٹے ہوئے گھر کے نکھارے ہیں

اسی چادر تلے جودو کرم نے زندگی پائی
اسی چادر تلے فاقوں نے اپنے دن گذارے ہیں

یہ چادر اک ورق ہے جس پہ رحمت کے فرشتوں نے
کبھی نقطے کبھی آیت کبھی سورے اتارے ہیں

اسی چادر کے ٹکڑے ہیں بہتر کربلا والے
اسی چادر کے جلووں نے رخ ہستی ابھارے ہیں

اگر سمٹے تو پھر اس کی تہیں ہفت آسماں جیسی
اگر پھیلے تو حد لامکاں اس کے کنارے ہیں

نہ تیروں سے نہ خنجر سے نہ تیغوں سے نہ لشکر سے
نصاریٰ وادی نجران میں چادر سے ہارے ہیں

یہی چادر تو محضر نامۂ شبیرؑ کہلائی
اسی چادر پہ حرف صلح شبرؑ نے ابھارے ہیں

یہ چادر تھام لینے پر ملے والعصر کا سورہ
یہ چادر چھوڑ دینے پر خسارے ہی خسارے ہیں

نبیؐ کے قلب پر قرآں اترا تیس پاروں کا
یہ چادر ایسا قرآن ہے بہتر جس کے پارے ہیں

اسی چادر میں سجدے بھی اذانیں بھی اقامت بھی
اسی چادر میں منبر ہے مصلے ہیں منارے ہیں

اسی چادر میں بخشش بھی عطا بھی اور شفاعت بھی
اسی چادر میں ڈھارس ہے امیدیں ہیں سہارے ہیں

اسی چادر نے بخشی ہیں سفر کی ساری تہذیبیں
اسی چادر میں ہر رستہ ہے منزل ہیں کنارے ہیں

اسی چادر تلے تسنیم بھی کوثر بھی طوبیٰ بھی
اسی چادر تلے امواج ہیں لہریں ہیں دھارے ہے

اسی چادر تلے ہر کارواں ہے کہکشاؤں کا
اسی چادر تلے شمعیں ہیں جگنو ہیں ستارے ہیں

ہر اک خوشبو، بھرا موسم ہے اس پھولوں کی چادر میں
نہ اس چادر میں شعلے ہیں نہ شر والے شرارے ہیں

ہے اس چادر کے اندر پنجتن کی جلوہ فرمائی
زمانے کے جو رشتے ہیں وہ چادر کے کنارے ہیں

سنبھل فکر رسا پیش نظر اس کے نظارے ہیں
فرشتوں نے بھی جس کے پاؤں پر سجدے کئے ہیں

رواں ہوتا ہے تجھ کو مدح زہراؑ کے مصلے پر
وضو کر لے قلم، یہ سامنے کوثر کے دھارے ہیں

وہ صدیقہ بھی مرضیہ بھی حور ابھی شفیعہ بھی
کہ جتنی عظمتیں ہیں سب پہ زہرا کے اجارے ہیں

وہی قطع زمیں میں اک آسماں ہے جس پہ وہ ٹھہریں
جوان کے فرش پا چھولیں وہی ذرے ستارے ہیں

یہ آٹھوں جنتیں بستر ہیں اس کے ماہ پاروں کا
یہ ساتوں عرش اسکے لاڈلوں کے گاہوارے ہیں

ابوطالب کے گھر کس نے قدم رکھے دلہن بن کر
ستارے جس کی افشاں چاند سورج گوشوارے ہیں

پدر ہیں شافع محشر تو شوہر ساقی کوثر
یہ سردار جوانان جناں اس کے دلارے ہیں

وہ خود خاتون محشر اس کی ماں خاتون مکہ ہے
اسی کے ٹکڑے کھا کھا کر عرب نے دن گذارے ہیں

جو اس کے لاڈلوں کو دیکھتا وہ یہ کہتا ہے
خدا نے اس زمین پر عرش کے ٹکڑے اتارے ہیں

ادارت اس نے فرمائی ہے عصمت کے جریدے کی
گواہی کے لئے اک دو نہیں چودہ شمارے ہیں

کبھی سائل کبھی قیدی کبھی مسکیں کی صورت
فرشتوں نے بھی اس کے در پہ کیا کیا روپ دھارے ہیں

کبھی حوا نے آکر خلد سے اس کی بلائیں لیں
کبھی مریم نے اسکے لال کے صدقے اتارے ہیں

وہ جب چاہیں جہاں چاہیں وہیں جنت اتر آئے
مکاں سے لامکاں تک اس کے بیٹوں کے اجارے ہیں

یہ اسرافیل یہ جبرئیل سب نوکر ہیں زہرا کے
کسی کے ذمے چکی ہے کسی کے گاہوارے ہیں

اجازت ہو تو اپنی جان دے دیں ان پہ ہم بی بی
جو دو ہو ہنستے ہوئے قرآن شانو پر تمہارے ہیں

محمدؐ ہی محمدؐ ہیں محمدؐ سے محمدؐ تک
گنو کا شائبہ زہرا میں کتنے ماہ پارے ہیں

اسی کا خانوادہ رہ گیا دریا پہ بھی پیاسا
سمندر کے سمندر آج تک اس غم میں کھارے ہیں

لکھا ہے آج تک صبت علیا کے کلیجے پر
جو راتوں سے بھی بھاری ہیں وہ دن اسنے گذارے ہیں

بہت سے بصرہ و بغداد ظاہر ہو نہیں پائے
نہ جانے کتنے زندانوں میں اس کے خوں کے گارے ہیں

خدا سے گفتگو کرتے ہیں ہم اس کے وسیلے سے
دعائیں ہیں وظیفے ہیں طلب ہیں استخارے ہیں

ادھر چکے ادھر قرآن یہاں فاتے وہاں سجدے
کہ اسکے گھر ہدایت کے لئے کتنے ادارے ہیں

زمیں و آسماں دو پاٹ ہیں اس کی ایک چکی کے
ستارے جسکے دانے اور اجالے جس کے دھارے ہیں

اسی چکی نے دی ہے روٹیاں مولائے قنبر کو
اسی چکی کے پروردہ محمد کے دلارے ہیں

اسی کی لوریوں میں نیند آتی ہے چراغوں کو
اسی کی گونج پر سورج نے اپنے خواب وارے ہیں

اسی چکی سے بس محنت کشوں نے جنگ جیتی ہے
اسی چکی سے سب مستکبرین وقت ہارے ہیں

اسی چکی کے پاٹوں نے حکومت پیس کر رکھ دی
اسی کی گردشوں نے تاج شاہوں کے اتارے ہیں

نبی کی لاڈلی چھالے نہیں تیری ہتھیلی پر
فضیلت کے فلک نے چاند اور سورج ابھارے ہیں

مدد کا وقت ہے اے کفو خیبر گیر ادرکنی
ہمارے سامنے مرحب صفت دشمن ہمارے ہیں

یزیدیت کا پھر حملہ ہے مسجد کے مناروں پر
مصلے پھر تمہارے دل کے ٹکڑوں کو پکارے ہیں

زمانے نے پہن رکھی پھر پوشاک کوفے کی
گھلا ہے زہر شربت میں گلابوں میں شرارے ہیں

زمانہ مانگتا ہے پھر کوئی عباس اے زہراؑ
ستم نے وقت کے کانوں سے پھر بندے اتارے ہیں

ہمیں بھی بھیک میں کچھ حرف دے دو فاطمہ زہراؑ
ملک کی طرح نیر ہم نے بھی دامن پسارے ہیں

❀❀❀

قصیدہ

زبان در مدح امام حسینؑ

ڈاکٹر عباس رضا نیرؔ جلالپوری

وہ مرد ہے جو قول پہ اپنے ڈٹا رہے
وعدہ اگر کرے تو خیال وفا رہے

باتیں اگر ہو صاف تو نیت بھی صاف ہو
آئینہ آئینے کے لئے آئینہ رہے

یوں قول کو قرار زباں کو ثبات ہو
پتھر پہ نقش جیسے ہمیشہ بنا رہے

دریا ہو آگ کا کہ سمندر ہو خون کا
مانند کوہ بات پہ اپنی جما رہے

وہ لب کشا جو ہو تو سماعت کے شہر میں
کوئی گماں رہے نہ کوئی واہمہ رہے

جس کی طرف سے بولے عدالت میں آ کے وہ
حق میں اسی بشر کے ہر اک فیصلہ رہے

خون جگر سے سینچے وہ اقوال کے شجر
پانی جو بند ہو بھی تو لہجہ ہرا رہے

تولے جو اس کے وزن کو میزان سامعہ
اس کی بات کی وزن سے پلہ جھکا رہے

دے کے زباں سمجھے کہ اک قرض لے لیا
جس کو اتارنے کے لئے سوچتا رہے

یہ طرز فکر رکھتے ہیں صادق زبان لوگ
باقی رہے جو بات تو باقی انا رہے

یہ عزم کا حصار ہی ضامن ہے قول کا
مرکز بنا رہے گا اگر دائرہ رہے

ایسے بھی حرف وقول کے تاجر ہوئے ہیں لوگ
جو قیمت زباں سے بھی نا آشنا رہے

پھر کے اٹھائے وعدے کئے اور زبان دی
لیکن ادا کے لمحے پس التوا رہے

لیکن اس اک رئیس زباں کا یہ قول تھا
یہ میرا سر رہے نہ رہے کربلا رہے

ہاں وہ امیر نطق ہی ممدوح ہے مرا
احکام جس کے امر الٰہی نما رہے

راہب رہے کہ فطرس و حر جو گدا رہے
شبیر کے کرم تو طلب سے سوا رہے

اس کی عطا بھی یوں ہے سر بزم ہل اتی
انگشتری میں جیسے نگینہ جڑا رہے

کیا اس کے خاندان کے لوگوں کا ذکر ہو
وہ جن کے انبیا سے بھی رتبے سوا رہے

نانا وہ باوقار کہ جب بھی سفر کرے
گرد و غبار راہ فلک ڈھونڈتا رہے

بابا وہ جس کے ہونٹوں کو چھو لیں تو حشر تک
دشت لغت میں لفظ سلونی بھر رہے

وہ ذی وقار ماں کہ اگر ہاتھ روک لے
چکی فلک سے آ کے ملک پیستا رہے

دادا بھی وہ امیر عرب مومن قریش
ایمان جس کے نقش قدم چومتا رہے

دادی وہ جس کے واسطے کعبے میں در بنے
پھر اس کی راہ میں کوئی دیوار کیا رہے

بھائی وہ صلح نامے کی شرطیں اگر لکھے
اس کے قلم کا تیغوں پہ بھی دبدبہ رہے

عباسؑ بھی اسی کا ہے بھائی کہ اس کا نام
جو ایک بار لے لے سدا باوفا رہے

وہ ذی حشم بہن کہ جب اس کی زباں کھلے
خطبوں میں اس کے لہجۂ مشکل کشا رہے

خود وہ کہ زندگی کی علامت کہیں اسے
گردن جو کٹ بھی جائے تو سر بولتا رہے

چاہے تو چاند کو بھی بلا لے زمین پہ
کہہ دے تو اک مقام پہ سورج رکا رہے

اس کی سخاوتوں کی فرشتوں میں دھوم ہے
حاتم بھی اس کو دور کھڑا دیکھتا رہے

ایسا شجاع اسکی شجاعت جو دیکھ لے
ماتھے سے آفتاب عرق پونچھتا رہے

قامت بڑھا دے سجدۂ ختمی مآب کی
پشت رسول پر جو وہ جلوہ نما رہے

تفہیم اس کی پھر بھی کٹھن ہے اگر بشر
تاحشر غور کرتا رہے سوچتا رہے

اتنی حسین اس نے بنائی ہے کربلا
اک بار جو بھی دیکھ لے سو دیکھتا رہے

خوشبو جب اسکے خوں کی بسی ہے تو پھر نہ کیوں
آب وہوائے کرب وبلا میں شفا رہے

کیا ہمتیں گھٹائے یہ تشنہ لبی کی دھوپ
جب آفتاب صبر و رضا جاں فزا رہے

لبہائے تشنگاں کا تقرب نہ پائے گا
یہ اور بات پاؤں میں دریا پڑا رہے

مقتل میں اب امام زماں بولنے کو ہے
جو جس جگہ رکا ہے وہیں پر رکا رہے

زینب نے اس لئے خطبہ بنا دیا
انکار منبروں سے سدا بولتا رہے

انکار نوک نیزہ پہ بھی بولتا رہا
بیعت کے حملہ حرف مگر بے نوا رہے

اس کے قصیدہ خواں کے لئے یہ بھی شرط ہے
لب پر ہنسی ہوں آنکھوں میں آنسو، سجا رہے

جب دل بنا ہے میرا غم شاہ کے لئے
پھر کیا جواز آکے کوئی دوسرا رہے

ہے تعزیہ بھی دل میں مرے اور علم بھی ہے
یہ قافیہ ردیف سے کیسے جدا رہے

شبیر کا دعاؤں میں جب واسطہ رہے
پھر دامن مراد نہ کیوں کر بھرا رہے

جب تک میری سانسوں کا یہ سلسلہ رہے
یارب یہ دل بھی ذوق ولا سے بھرا رہے

جب تک نہ بند ہو مراد روزۂ حیات
مداحی حسینؑ کا دفتر کھلا رہے

اک وادیٔ فضا کل سبط رسول میں
کھو جاؤں میں زمانہ مجھے ڈھونڈتا رہے

معجور تاج خسر و جم کیا کروں گا میں
سر پر مرے غبار رہ کر بلا رہے

کرب و بلائے عرصہ حاضر کے جس میں
میرا نصیب خر کی طرح جاگتا رہے

تحریر کربلا مری جملہ حیات ہو
آئے خبر خوشی کی تو غم مبتدا رہے

نکلے اگر سفر پہ مجرم کا ماہتاب
آنکھوں میں میری اسکا اک اک نقش پا رہے

یارب جو شہ کے فرش عزا سے اتر بھی آؤں
آنکھوں میں آنسوؤں کا یہ دریا چڑھا رہے

نیر ہے محو مدح جگر بند فاطمہؑ
کہہ دو ابھی اجل کا فرشتہ رکا رہے

❀❀❀

شعر و ادب

امّ ابیہا

ڈاکٹر عباس رضا نیّر جلالپوری

مریمؑ ہیں، ہاجرہ ہیں نہ سارہؑ ہیں فاطمہؑ
قد آئینوں کے پشت ہیں بالا ہیں فاطمہؑ

قدرت نے جو دیا ہے وہ تحفہ ہیں فاطمہؑ
معراجِ مصطفیٰ کا نتیجہ ہیں فاطمہؑ

خیبر شکن کے واسطے پیسی ہیں چکیاں
مشکل کشا علیؑ کا سہرا ہیں فاطمہؑ

پرچھائیں بھی نہ دیکھی کبھی دن کی دھوپ نے
نکلا نہ جو ردا سے وہ چہرہ ہیں فاطمہؑ

حیدرؑ ہیں وہ نماز شجاعت نے جو پڑھی
عصمت نے جو کیا ہے وہ سجدہ ہیں فاطمہؑ

مانا کہ انبیا سے سواپائے ہیں لقب
پھر بھی ہر اک لقب سے زیادہ ہیں فاطمہؑ

گودی میں لیے فخر سے جھومیں نہ کیوں رسولؐ
کل زندگی کی ایک تمنا ہیں فاطمہؑ

لہجہ وہی مزاج وہی گفتگو وہی
قرآن علیؑ ہیں نہج بلاغہ ہیں فاطمہؑ